صاحب

محمد طفیل

اِدارۂ فروغِ اُردو ○ لاہور

صاحب

جملہ حقوق محفوظ ہیں

بارچہارم ۱۹۸۶ء

تعداد ایک ہزار

محمد طفیل پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور
سے چھپوا کر شائع کی ۔

یہ صفحہ اقتباس کے لئے خالی ہے

صاحب ، ۱۱

صاحب ، ۴۹

صاحب ، ۸۱

صاحب ، ۱۰۵

صاحب ، ۱۳۷

صاحب ، ۱۶۹

صاحب ، ۱۸۵

اعترافِ جرم

میں نے یہ کتاب کیوں لکھی ؟

لکھی تو چھپوائی کیوں ؟

دونوں جرم تسلیم، چونکہ آج تک کتابیں لکھی جاتی رہی ہیں، اور چھپتی بھی رہتی ہیں۔ اس لیے میں نے بھی لکھ کر چھپوا دی۔

اگر میری طرح کچھ اور لوگ بھی لکھنے اور چھپنے سے پہلے اپنی تخلیقات کے معیار کا اندازہ کر سکتے، تو نہ یہ کتاب چھپتی، اور نہ ایسی لاکھوں کتابیں۔

اس مسئلہ پر اگر سنجیدگی سے غور کیا جائے کہ اب تک کتنی کتابیں ایسی ہیں جن کو چھپنا چاہیے تھا، تو ان کی تعداد بمشکل دہائیوں سے نکل کر سینکڑوں تک پہنچے گی۔

میں نے بھی یہ کتاب لکھ کر کوئی بہت بڑا تیر نہیں مارا ہے۔ تیر تو انھوں نے مارا جو سادہ لوحوں کو یہ پڑھنی پڑی۔

مقصد بھی سوائے اس کے کچھ نہیں کہ اپنا اور دوسروں کا وقت ضائع کروں۔

دوسرے لکھنے والے اپنی کتابوں کو پیش کرتے وقت یہ سوچتے ہوں گے اور سوچتے ہیں کہ ہماری کتاب کے آتے ہی اُردو ادب میں انقلاب آجائے گا۔ میں اپنی کتاب پیش کرتے ہوئے یوں محسوس کر رہا ہوں، جیسے آیا ہوا انقلاب ختم جائے گا، رکے گا نہیں، اس لیے کہ میرے بعد بھی بہت سے لکھنے والے پیدا ہوں گے۔

میرے مضامین لکھنے کی ابتدا اختیاری نہیں اضطراری ہے۔

مارچ ۱۹۵۳ء میں جب قادیانی تحریک کے سلسلے میں معرکے سر ہونے شروع ہوئے تو نوبت مارشل لا تک پہنچی تھی۔ چونکہ فطرتاً ہنگامہ کا نہیں ہوں۔ اسی لیے مجبوراً گھر بیٹھنا پڑا۔ پہلے گھر والوں سے لڑنے جھگڑنے کا سلسلہ چلایا۔ جب اس مشغلے سے طبیعت سیر ہو گئی، تو یہ مضامین لکھنے شروع کیے جو انشاء اللہ آئندہ جھگڑوں کا موجب بنیں گے۔

کوئی کہے گا "خوب لکھے ہیں مضامین"

کوئی عقلمند ہوا تو جواب ملے گا۔ "نہایت واہیات۔"
میرا ووٹ دوسرے فریق کے ساتھ ہوگا، جو بُری چیز کو بُری سمجھنے کی اہلیت تو رکھتا ہے:
کاش ایسے "سمجھ ناک" حضرات کی تعداد کچھ زیادہ ہوتی۔
قاضی جی جب شہر کے اندیشے میں دُبلے ہوئے تھے تو اس بیچارے نے بھی میری ہی طرح سوچا تھا۔
مجھے بھی جب شخصیت نگاری کا میدان قریب قریب سنسان نظر آیا تو میں نے شخصی مضامین لکھے۔ اگر مجھے شعری ادب ڈوبتا نظر آتا تو شعر کہتا، اگر تنقید میں ہُو کا عالم دیکھتا تو اس صنف میں بھی اپنا لوہا منوا کر رہتا۔ اس لیے کہ مجھے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی تھا۔
غرض جو میدان مجھے خالی نظر آیا اور اس کو میں نے جس طرح پامال کیا اُس کا تحریری ثبوت اس کتاب کی صورت میں پیش کر کے اپنی "دنیوی عاقبت" سنوارنے یا بگاڑنے کا ارادہ ہے۔
بغیر سوچے سمجھے جب میں نے کتاب چھاپ ہی دی ہے تو اس کی اچھائی اور برائی کی بحث سے مجھے کیا مطلب۔ مجھے تو اپنی باتیں نا بٹہ توڑ کہنی چاہئیں۔ جو میں نے اس کتاب کے سلسلے میں ملحوظ رکھی ہوں۔
میں نے چاہا ہے کہ عام بول چال اور بہت ہی سادہ سے اسلوب میں چہروں کی نقاب کشائی کرتا جاؤں۔ اس سلسلے میں کسی سے مرعوب ہو کر نہیں لکھا۔ نہ ہی کسی کو غلط انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔
طرزِ بیان میں خامی ہو تو ہو شخصیتوں کے مطالعہ میں مجھ سے زیادہ چوک نہیں ہوئی اور اس طرزِ بیان کو میں نے اس لیے اپنایا کہ میرے خیال میں ضروری ہے کہ لکھنے والا شخصیت میں گھسا ہوا نظر نہ آئے بلکہ شخصیت ہی رواں دواں دکھائی دے۔ اگر مصنف خود کو لانے پر مجبور ہی ہو تو ایسے جیسے قمیص میں بٹن، نہ کہ بٹن میں قمیص ___ اور ان مضامین میں میری "شخصیت" ایک وسیلہ محض۔
اتنا بڑا دعویٰ مجھے زیب تو نہیں دیتا۔ لیکن میں نے کوشش کی ہے اسی امر کی۔ کچھ مضامین کو گھٹا بڑھا دیا ہے۔ اس سے بھی مضامین کا معیار نہ بڑھا نہ گھٹا، جو تھا وہی ہے۔
صاحبان کے تذکروں کا نام صاحب؟
جی ہاں، ہر بات اُلٹی۔

محمد طفیل
۲۹ جولائی ۱۹۵۵ء

منٹو صاحب

اِس مضمون کے دو حصّے ہیں ۔ پہلا حصّہ منٹو صاحب کی زندگی میں اور دوسرا حصّہ ان کے انتقال کے بعد لکھا گیا۔

(۱)

اس وقت سر میں شدید درد ہے، نہ جانے یہ جی کیوں چاہتا ہے کہ درد بڑھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں اس وقت منٹو پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ درد کی نوعیت نہ بدل جائے۔ اِس لیے کہ میں نے منٹو کے افسانے پڑھتے ہوئے عموماً سر کی بجائے دل میں درد محسوس کیا ہے۔ میرے علاوہ اور بھی کئی ایک اسی اذیت میں مبتلا ہوں گے۔ بعضوں کے دل میں ان کے اندازِ بیان کی رنگینی اور چٹ پٹے پن سے درد ہوتا ہوگا۔ بعضوں کے دل میں ان کی تحریروں کے تأثر اور اس کے بھرپور وار سے درد ہوتا ہے میرا شمار کن میں ہے؟ یہ میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔ اس لیے کہ میں اس وقت منٹو کے فن کی بجائے ان کی شخصیت پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ منٹو کے فن پر

لکھنے کا حق ہمیشہ کی طرح نقادانِ کرام کو سونپتا ہوں۔ ورنہ وہ محاورہ صادق آ جائے گا کہ چھوٹا منہ اور بڑی بات۔

ایک دن انارکلی میں ایک صاحب کو افسانوی انداز میں پیدل چلتے دیکھا تو ذہن میں آیا کہ اسے منٹو ہونا چاہیے۔ یہ خیال اس لیے بھی ذہن میں آ سکتا تھا کہ منٹو صاحب بمبئی سے لاہور آ چکے تھے۔ چند دنوں بعد ایک صاحب ہمارے دفتر کے سامنے سے سائیکل پر گزرے، سائیکل بالکل نئی تھی۔ صاحب سائیکل نے ہمارے دفتر کے اندر کچھ اس نئے انداز سے دیکھا کہ ذہن میں پھر آیا کہ وہ منٹو گیا۔

ابھی تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ برادرم احمد ندیم قاسمی آئے اور انھوں نے بتایا میں آپ کے پاس ٹھیک وقت پر پہنچ جاتا۔ لیکن راستے میں منٹو صاحب مل گئے تھے۔ اس لیے آدھ گھنٹہ اُن سے باتوں میں گزر گیا۔

کچھ دنوں بعد جب پھر ندیم صاحب آئے تو ان کے ہمراہ ایک اور صاحب بھی تھے۔ وہی جن کو میں نے انارکلی میں دیکھا تھا یا دفتر کے سامنے سائیکل پر گزرتے دیکھا تھا۔ ندیم صاحب نے تعارف کرایا "آپ سعادت حسن منٹو ہیں۔" اور میری طرف اشارہ کر کے "آپ طفیل صاحب ہیں۔"

منٹو صاحب میں سو خوبیوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ موجود ہوں، تو دوسرا لاکھ کوشش کرے، وہ کسی کو بولنے نہیں دیں گے۔ باتیں ان کی دلچسپ اور معلوماتی ہوتی ہیں۔ وہ میرے پاس پہلی مرتبہ آئے تھے، اور آتے ہی انھوں نے باتیں شروع کر دی تھیں۔ اس لیے مجھے موقع ہی نہ مل سکا کہ پانی وانی کے لیے پوچھتا۔ پھر بھی میں نے ان کے

مسلسل بیان میں یہ بات چھوڑ دی۔

"منٹو صاحب چائے پئیں گے؟"

منٹو صاحب اس وقت نان اسٹاپ موڈ میں تھے۔ اس لیے انھیں میری مروّت بھی ناگوار گزری اور جھٹ بولے "ہٹاؤ یار، اس وقت چائے سے زیادہ گرم باتیں ہو رہی ہیں ـــــ"

باتوں کا تسلسل تو ٹوٹ ہی چکا تھا۔ اس لیے کسی اور طرف چل نکلے اور ندیم صاحب سے کہا "حیدرآباد دکن میں کسی ایک کو یہ فکر تھی اور ہے کہ میری شادی عصمت سے ہونی چاہیے تھی۔ نہ جانے یہ لوگ ایسی باتیں کیوں سوچتے ہیں۔ جب یہ بات میری بیوی نے سُنی تو وہ کباب ہو گئی۔ اس لیے کہ دونوں کی آپس میں بڑی دوستی ہے۔ پھر حق زوجیت پر بھی آنچ آ رہی تھی۔ اس لیے اس کا کباب ہونا برحق تھا" ـــ پھر ـــ "ارے یار بمبئے کا کیا پوچھتے ہو۔ اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے، بڑے ٹھاٹ سے دن گزارے ہیں۔ ڈیڑھ دو ہزار کی آمدنی تھی۔ بڑی قدر تھی۔ ہر کوئی منٹو منٹو کرتا تھا۔ مملکتِ خداداد میں آئے تو پبلشروں کے پاس خود جانا پڑا کہ بھئی ہماری کتاب چھاپ لو۔ کئی بار جی چاہا کہ بیچ سڑک کھڑا ہو کر پاکستان زندہ باد کا نعرہ لگاؤں، پھر سوچتا ہوں کہ لوگ مجھے پاگل کہیں گے ـــ"

اس تذکرے پر منٹو صاحب ذرا افسردہ ہو گئے اور شاید افسردگی ہی دور کرنے کے لیے انھوں نے اپنا خوبصورت سگریٹ کیس نکالا، ایک سگریٹ ندیم صاحب کو دیا ایک خود اپنے باریک باریک لبوں پر اٹکایا، جیب سے ماچس نکال ہی رہے تھے کہ

ایک دم میری موجودگی کا خیال آیا اور بولے "بھئی معاف کرنا" اور سگریٹ کیس میری طرف بڑھا دیا۔

ندیم صاحب نے مشکل کشائی کی اور کہا کہ یہ نہیں پیتے۔ منٹو صاحب پینے کے لفظ کو لے اُڑے۔ "ہائے کمبخت تُو نے پی ہی نہیں۔ سگریٹ پینا کیا ہوتا ہے۔ پینا تو وہ ہوتا ہے ـــــ"

پھر ندیم صاحب سے پوچھا "قاسمی صاحب آپ نے میرا مضمون "سویرے جو کل آنکھ میری کھلی" پڑھا ہے؟" ندیم صاحب نے حسبِ عادت "جی ہاں" کہا۔ "چھوڑ یار وہ مضمون کیہہ اے، بکواس اے"

منٹو صاحب کی یہ عادت ہے کہ اگر ان کی کسی چیز کی تعریف کی جائے تو وہ عموماً یہی جواب دیتے ہیں، یا صرف اتنا کہہ دیں گے "بس ٹھیک ہے" پھر خود ہی اسی مضمون کی تعریف شروع کر دیں گے اور وہ بھی حوالے دے دے کر مثلاً اس میں وہ فقرہ بڑا اچھا تھا کہ

> "صبح کا وقت تھا۔ عجب بہار تھی اور عجب سیر تھی۔ قریب قریب ساری دکانیں بند تھیں۔ ایک حلوائی کی دکان کھلی تھی۔ دکان کی طرف بڑھا تو کیا دیکھتا ہوں بجلی کا پنکھا چل رہا ہے لیکن اس کا منہ دوسری طرف ہے۔ میں نے حلوائی سے کہا "یہ اُلٹے رُخ پنکھا چلانے کا کیا مطلب ہے؟" اُس نے گھور کر مجھے دیکھا اور کہا "دیکھتے نہیں ہو" ـــــ میں نے دیکھا ـــــ پنکھے کا رُخ قائدِ اعظم محمد علی جناح

کی تصویر کی طرف تھا۔"

پھر انھیں کوئی دوسرا پیراگراف یاد آگیا تو وہ بھی سنا دیا :

"ایک دم شور برپا ہو گیا کیا دیکھتا ہوں کہ لڑکے ہاتھوں میں
کاغذ کے بنڈل لیے چلا رہے ہیں اور اندھا دھند بھاگ رہے ہیں۔
بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آئیں۔ اخبار بک رہے تھے۔
تازہ تازہ اور گرما گرم خبریں۔ دہلی میں جوتا چل گیا لکھنؤ میں فلاں کوٹھی
پر کتوں نے حملہ کر دیا۔ پاکستان کے ایک نجومی کی پیشگوئی۔ کشمیر
دو ہفتوں میں آزاد ہو جائے گا۔"

(اس وقت انھوں نے یہ فقرے بغیر کسی ربط کے سنائے تھے۔ یہاں ان کی کتاب سے نقل کر دئے گئے ہیں)

اس کے بعد بھی رُکے کہاں۔ کہنے لگے "آج کل عجیب موڈ ہے۔ افسانہ لکھنا چاہتا ہوں تو مضمون ہو جاتا ہے۔ اگر مضمون لکھنا چاہوں گا تو ڈرامہ ہو جائے گا۔"
—— نہ جانے اس وقت مجھے بیٹھے بٹھائے کیا ہو گیا اور پھٹ سے بول پڑا۔
"اگر آپ نے بیک وقت ڈرامہ، افسانہ اور مضمون لکھنا چاہا تو آپ سوالیہ نشان بن کر رہ جائیں گے۔"

اس فقرے پر منٹو صاحب محظوظ ہوئے اور کہا "اچھا اے، اچھا اے۔ چونکہ انھیں اپنے پہ کوئی چبھتی ہوئی بات گوارا نہیں ہوتی، اس لیے ذرا سوچ کر بول ہی پڑے
"بات تو آپ نے اچھی کہی ہے، بدقسمتی سے میری اور آپ کی بے تکلفی نہیں۔ اس لیے

جواب ارسال کرنے سے معذور ہوں"

ندیم صاحب سمجھ گئے کہ یہ اس وقت کس قسم کا جواب دے سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے مسکرا کر کہا۔ "آپ انھیں کوئی جواب نہ دیں۔ یہ ذرا اور قسم کے آدمی ہیں۔" اور قسم سے اس وقت نہ جانے ان کی مراد کیا تھی۔ لیکن منٹو صاحب کی باتوں کا رُخ قسموں کی طرف چل نکلا اور کہا۔ "آپ نے میرا مضمون ناک کی قسمیں پڑھا ہو گا۔ وہ 'وہ ہاں رہی

آئی جو اُن کی ناک تو آتی چلی گئی

میں نے اس مضمون میں ناک کی قسمیں گنوائی ہیں۔ اس مضمون میں ایک شعر بھی کوٹ کیا ہے جو مجھے ناک کی مناسبت سے بڑا پسند ہے۔ وہ کیا ہے تنکا بھئی وہ تنکا۔ ہاں!

ناک میں نیم کا فقط تنکا
شوخی چالاکی اقتضا سن کا

اس کے بعد انھوں نے اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے موٹے موٹے شیشوں والی عینک میں سے دیکھ کر ندیم صاحب سے پوچھا۔ "آپ یہاں بیٹھیں گے ؟"

ندیم صاحب نے اپنا تکیہ کلام دہرا دیا۔ "جی ہاں!" تو آپ کھڑے ہو گئے اور کہا۔ "اچھا بھئی میں چلتا ہوں۔"

پھر تو ان سے اکثر ملاقاتیں رہیں۔ قریب قریب روز۔ عموماً ان کی ملاقاتوں کا انداز یہ ہوتا ہے کہ مسلسل ملاقاتیں بخشیں گے۔ کبھی کبھی اچانک ناپید ہو جائیں گے۔ بات صرف اتنی ہو گی کہ ملاقاتوں کا رُخ کسی اور کی طرف مڑ جائے گا۔ ان کا یوں روپوش رہنا چند دنوں کا یا زیادہ سے زیادہ چند ہفتوں کا ہو گا۔ تانگے سے اُترتے ہی دُور سے السلام علیکم کے ساتھ

ملاقات پھینک دیں گے۔ پھر یہ کہیں گے "دس روپے یا پندرہ روپے دوائی کے لیے دینا" جو دینے پڑتے ہیں۔ لوگ دوائی اس لیے پیتے ہیں کہ صحت یاب ہوں لیکن یہ دوائی اس لیے پیتے ہیں کہ صحت اور خراب ہو۔ ان کی دوائی کا نام شراب ہے پہلے یہ دوائی کو پیتے ہوں گے۔ اب تو دوائی انھیں پی گئی۔ اور کسی دن بیٹھے بٹھائے ہم یہ سُن لیں گے کہ منٹو صاحب کا انتقال ہو گیا۔

یہ سب جانتے ہیں کہ منٹو اُردو کا ممتاز افسانہ نگار ہے، جو ان کی اس حیثیت سے منکر ہیں، مجھے اُن کی رائے سے اتفاق نہیں۔ لیکن ایک بار ایسا بھی ہوا کہ منٹو صاحب نے ایک افسانہ مجھے نقوش کے لیے دیا۔ جس کا نام "نطفہ" تھا۔ میں نے وہ افسانہ پڑھا تو مجھے پسند نہ آیا۔ ڈرتے ڈرتے اس کا اظہار ان سے کیا۔

منٹو صاحب نے بُرا نہ مانا بلکہ ایک اور افسانہ لکھ دیا۔ میری نظر میں وہ بھی پہلے جیسا ہی تھا۔ جب منٹو صاحب کو دوسرے افسانے کے متعلق بھی میری رائے کا علم ہوا تو انھوں نے کہا کہ کل ایک اور افسانہ لکھ دوں گا اور اس وقت تک لکھتا رہوں گا۔ جب تک کہ آپ یہ نہ کہہ دیں کہ یہ افسانہ مجھے پسند ہے۔

اس کے بعد انھوں نے مجھے ایک ایک دن کے وقفے سے دو افسانے دیئے وہ دونوں مجھے بے حد پسند آئے۔ ایک کا نام "موذیل" تھا اور دوسرے کا نام "سڑک کے کنارے"

مندرجہ بالا واقعہ کے اظہار کا میرے نزدیک سوائے اس کے اور کوئی مقصد نہیں کہ اتنا بڑا لکھنے والا اتنے بڑے دل گُردے کا بھی مالک ہے۔ ہر فن کار کو اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ تحریر بھی بڑی عزیز ہوتی ہے اور وہ اس کی شان میں ایک حرف بھی سننے کے لیے تیار

نہیں ہوتا اور پھر منٹو ایسا فن کار، جو فن کار بھی ہے اور منہ پھٹ بھی۔ اس وقت انھوں نے نہ مجھے یہ طعنہ دیا کہ میں بہت بڑا ایکلیکٹک ہوں اور نہ ہی یہ ثابت ہونے دیا کہ منہ پھٹ بھی ہوں۔

ویسے ان کی زبان کے آگے کوئی خندق نہیں۔ کبھی کبھی پی کر آجائیں گے اور کہیں گے "کل آپ نے فلاں صاحب کے سامنے کیا بکواس کی تھی، میری جان! میرے اور اس کے تعلقات اور قسم کے ہیں۔ معاف کرنا۔ وہ بھی حرامزادہ میں بھی حرامزادہ پر آپ کو کیا پڑی تھی کہ وہی بات آپ اس سے بھی کہہ دیں، جو میں نے آپ سے چھپا کر کہی تھی ویسے میں ڈرتا تو نہیں ہوں، وہ میرا کیا کر لے گا، میری جان! آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ معاف کرنا آپ کو پتہ نہیں کہ آپ نے بڑی کمینہ حرکت کی۔ جب میں نے سنا تو کباب ہو گیا۔ میری ....."

میں ایسے مواقع پر خاموش رہتا ہوں یا صرف مسکرا دیا کرتا ہوں۔ اس لیے کہ اس وقت ان کی باتوں کا کوئی سر پیر نہیں ہوتا اور اس وقت منٹو کی بجائے شراب بول رہی ہوتی ہے۔

بعض اوقات جب منٹو اور شراب مل کر بولتے ہیں تو اس وقت منٹو پر بھی پیار آتا ہے اور اس کی باتوں پر بھی۔ لیکن ایسے مواقع ذرا کم ہی آتے ہیں۔ عموماً وہ پی کر واہی تباہی بکتے ہیں۔ وہ اپنی انھی باتوں کی بدولت دو بار پاگل خانے جا چکے ہیں۔

پہلی مرتبہ منٹو صاحب راضی خوشی خود ہی گئے تھے۔ دوسری مرتبہ زبردستی ان کے گھر والوں نے بھیجا۔ ان کی دوبارہ واپسی پر میں نے ان سے پوچھا تھا کہ منٹو صاحب آپ کس خوشی میں مینٹل ہاسپٹل جاتے اور آتے ہیں۔

کہنے لگے کہ بھئی پہلی مرتبہ تو خود بڑے چاؤ سے گیا تھا کہ وہاں جاکر ذرا شراب چھوڑ آؤں۔ سنا تھا کہ وہاں اس انداز سے علاج کیا جاتا ہے کہ آدمی آسانی کے ساتھ شراب ترک کر دیتا ہے لیکن وہاں جاکر جو طبیعت صاف ہوئی۔ وہ بیان نہیں کر سکتا۔ دوسری مرتبہ گھر والوں نے زبردستی بھجوا دیا۔ حالانکہ میں نے ان کی بڑی منت سماجت کی۔ لیکن کسی نے ایک نہ سُنی۔ وہاں پہنچ کر میں نے ڈاکٹروں سے کہا کہ میرا ذہنی معائنہ کرایا جائے اس لیے کہ میں بالکل ٹھیک ہوں لیکن ڈاکٹروں نے بھی ایک نہ سُنی۔ کل میرے ایک دوست مجھے ملنے آئے تھے، تو میں اُن کے ساتھ چلا آیا۔ وہ مجھے ڈھونڈتے ہوں گے، ڈھونڈھا کریں۔ پاگل کہیں کے۔

منٹو صاحب کا مزا اس وقت آتا ہے جب اُن سے عریانی یا فحاشی کے موضوع پر گفتگو کی جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ مجھے بڑی حیرت ہے کہ لوگوں نے میرے وہ بیشمار افسانے نظر انداز کر دئیے۔ جن میں جنس کا تذکرہ تک نہیں۔ میں نے جنسی افسانے تو شاید چند ایک ہی لکھے ہیں باقی تو بس افسانے ہیں۔ جن حضرات کو میرے افسانوں میں فحاشی نظر آتی ہے، وہی دکان دکان پھرتے ہیں اور پوچھتے ہیں کہ منٹو کی کوئی نئی کتاب آئی۔ ان کا خیال ہے کہ میری تحریریں یا تو وہ حضرات پڑھتے ہیں جنہیں میرے فن سے پیار ہے یا "اعتراضیئے" پڑھتے ہیں تاکہ مجھے بُرا بھلا کہہ سکیں۔ میں بھی وقت آنے پر ہر ایک کا قرضہ چکا دیتا ہوں یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنی ایک کتاب کا انتساب یوں کیا تھا:

"ایڈیٹر دین و دنیا کے نام جس نے مجھے سب سے زیادہ گالیاں دیں"

اب جی چاہتا ہے کہ قبلہ مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کے نام بھی ایک

کتاب معنون کردوں۔ اس لیے کہ موصوف نے میرے خلاف لکھ لکھ کر میرے افسانوں کی قدر کی ہے۔ اگر میں اپنی زندگی میں ایسا نہ کر سکا، تو بہت ممکن ہے کہ حشر کے دن موصوف دامن گیر ہوں اور مجھے ندامت ہو۔

بھئی ان محترم ہستیوں کا تذکرہ چھوڑو۔ میرے دوست قاسمی صاحب نے بھی میرے نام ایک کھلی چٹھی لکھ دی۔ میرا بڑا دل چاہا کہ میں بھی بند لفافہ لکھ کر چھپوا دوں لیکن قاسمی صاحب کی شرافت آڑے آگئی۔ عسکری نے سیاہ حاشیے پر دیباچہ لکھ دیا تو یاروں نے اڑا دیا کہ مجھ پر عسکری چھایا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ خود اتنا سیدھا سادا اور بھولا بھالا ہے کہ اپنے اوپر تو چھا نہیں سکا، مجھ پر کیا چھاتا۔

پہلے ترقی پسند میری تحریروں کو اُچھالتے تھے اور فخر کرتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے اب یہ کہتے ہیں کہ منٹو ہم میں سے نہیں ہے۔ مجھے نہ ان کی پہلی بات پر یقین تھا، نہ موجودہ پر ہے۔ پہلے ترقی پسند کہتے تھے کہ منٹو ہم میں سے ہے میں کہتا تھا، ٹھیک ہے۔ اب مجھے حلقۂ ارباب ذوق والوں نے اپنا ممبر بنا لیا ہے۔ میں کہتا ہوں ٹھیک ہے۔ مجھ سے کوئی پوچھے کہ منٹو تم کس جماعت میں سے ہو تو میں عرض کروں گا کہ میں اکیلا ہوں، ہر معاملے میں اکیلا ہوں۔ جس دن میرا کوئی ثانی پیدا ہو گیا، میں لکھنا چھوڑ دوں گا۔ ویسے کوئی جماعت میرے نام کو اپنی فہرست میں شامل کر کے فخر کر سکتی ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اب منٹو صاحب میں یہ کمزوری راہ پا گئی ہے کہ وہ ہر ایک سے کہیں گے کہ کل فلاں صاحب ملے تھے اور انھوں نے میرے فلاں افسانے کی بڑی تعریف کی۔

پرسوں کراچی سے ایک صاحب آئے تھے نہ جانے ان کا نام کیا تھا وہ
کہتے تھے کہ منٹو صاحب میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ
میں آپ کو اُردو کا سب سے بڑا افسانہ نگار مانتا ہوں ——
کل فلاں صاحب نے شیخوپورہ سے دو کنستر گھی کے اس لیے بھیج ادئے کہ
وہ مجھے بڑا رائٹر سمجھتے ہیں۔
میں نے مال روڈ پر ایک دکاندار کو اپنی دو تصویریں فریم کے لیے دی تھیں۔
کوئی صاحب محبت کے اظہار کے طور پر وہاں سے فریم کے روپے دے کر میری
دونوں تصویریں لے گئے۔
میرا یہ سگریٹ کیس گم ہو گیا تھا۔ اس کے دوسرے دن ایک صاحب اسے
لیے ہوئے آپہنچے اور کہا منٹو صاحب السلام علیکم! یہ اپنا سگریٹ کیس لیجیے مجھے
فلاں جگہ پڑا ہوا ملا تھا۔ میں نے اُن سے کہا۔ آپ کو کیسے علم ہوا کہ میں یہاں رہتا
ہوں، وہ کہنے لگے۔ واہ آپ کو بھلا کون نہیں جانتا۔
اُدھر ممتاز شیریں میرے فن پر کتاب لکھ رہی ہیں۔ ادھر میرے افسانوں کا
انگریزی میں ترجمہ چھپ رہا ہے
ایک دن ایک صاحب نے لکشمی مینشن میں افیون کھا لی۔ ڈاکٹر بلایا گیا۔
ڈاکٹر نے قے کرانے کے لیے کوئی دوا تجویز کی۔ مگر اس نے دوائی پینے سے انکار
کر دیا اور کہا کہ میں مرنا چاہتا ہوں۔ شور جو مچا تو میں بھی پہنچا، میں نے کہا بھئی دوا
پی لو۔ اُس نے کہا۔ تم کون ہو؟ میں نے کہا۔ میں منٹو ہوں۔ اس نے اسی حالت میں کہا۔

بڑا اچھا ہوا کہ میں نے آپ کو مرنے سے پہلے دیکھ لیا۔ میں آپ کو بہت بڑا ادیب سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے اسے حکم دیا کہ تمھیں دوائی پینا ہوگی۔ چنانچہ اس نے دوا پی لی۔

ایک دن میں انار کلی اور مال روڈ کے درمیان بیہوش ہوگیا۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ کیا ہوا۔ بس اتنا یاد ہے کہ کچھ ایسے معلوم ہوا کہ کسی نے میری گردن پر کلہاڑا مارا اور میں بیہوش، کوئی آدھ گھنٹے کے بعد ہوش آیا تو دیکھا کہ ایک سائیکلوں کی دکان میں لوہے کی کرسی پر بیٹھا ہوں۔ ایک ہجوم میرے ارد گرد، سب غٹر غوں کر رہے ہیں۔

میں نے کہا۔ "ماجرا کیا ہے؟"

انھوں نے جواب دیا۔ "آپ کو چوٹ تو نہیں لگی؟"

"میرے کپڑے کیوں گیلے ہیں؟"

"اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟"

میں نے سٹپٹا کر کہا۔ "کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم لوگوں نے میرا جلوس کس سلسلے میں نکالا ہے۔"

معلوم ہوا کہ میں بیہوش ہو گیا تھا۔ اس لیے لوگوں نے پانی کے چھینٹے مار مار کے، مجھے ہوش میں لانا چاہا تھا۔ یہ بھی علم ہوا کہ بعض لوگوں کا خیال تھا۔ مجھے مرگی کا دورہ پڑا ہے، اس لیے مجھے خوب خوب جوتیاں سونگھائی گئیں۔

جب میں نے یہ بات سُنی تو مجھے خطرہ پیدا ہوا۔ ناک کو ہاتھ لگا کے دیکھا کہ کوئی چھوٹی سی جُوتی اس کے اندر تو نہیں رہ گئی۔ یہی وجہ تھی کہ میں ایک دم

گھبرا کے اٹھ کھڑا ہوا۔ لوگوں سے کہا ”میں گھر جانا چاہتا ہوں، تانگہ منگوا دو۔“
تانگہ منگوایا گیا۔ اب سب مُصر کہ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے۔ ہم منٹو صاحب کو گھر چھوڑنے جائیں گے۔ چنانچہ میں ان لوگوں میں سے تین صاحبان کو ساتھ لے کر گھر کی طرف تانگے پر چل دیا۔ اُن میں سے ایک صاحب نے کہا۔ منٹو صاحب میری خوش قسمتی ہے کہ آج آپ سے اس ڈراماتی انداز میں ملاقات ہو گئی۔ میں آپ کو دنیا کا بہترین افسانہ نگار مانتا ہوں میں نے فلاں فلاں مغربی افسانہ نگاروں کو پڑھا ہے لیکن آپ کے سامنے سب ہیچ ہیں ــــ

میں نے اُن صاحب سے کہا کہ میں کیا ہوں، بس ایک افسانہ نگار ہوں۔ اب تو میں افسانہ نگار بھی نہیں ہوں! افسانہ نگار اُس وقت ہوتا ہوں۔ جب میرے ہاتھ میں قلم ہوتا ہے۔ جب میرے ہاتھ میں قلم نہیں ہوتا، اس وقت میں کچھ نہیں ہوتا۔ اب افسانے کہاں ہیں جنھیں لکھوں افسانے اُدھر رہ گئے۔ جو افسانے اِدھر تھے انھیں بھی مار بھگایا، اُدھر یا اُن کے ساتھ کچھ اور کر لیا گیا۔ وہاں ایک سڑک پر کئی افسانے ملتے تھے۔ یہاں کئی سڑکوں پر ایک افسانہ نہیں ملتا۔ اب یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ سعادت حسن منٹو مال روڈ کے قریب بیہوش ہو گیا اور لوگوں نے اس کی پانی کے چھینٹوں اور جوتوں سے تواضع کی۔ میری جان! یہ افسانہ تھوڑا ہے کہ ــــ“

ایک بار کسی صاحب نے ان کے افسانے 'موذیل' کی بات چھیڑ دی۔ منٹو صاحب گویا ہوئے۔ وہ افسانہ میں نے تھوڑا ہی لکھا ہے۔ وہ تو موذیل نے لکھوایا تھا۔ بھئی مجھے افسانہ لکھتے وقت کچھ پتہ نہیں ہوتا کہ مجھے کیا لکھنا ہے۔ قلم دوات سنبھالتا ہوں

تو کاغذ کے اوپر ۷۸۶ لکھ دیتا ہوں۔ پھر سوچتا ہوں کہ افسانہ لکھنا ہے افسانہ لکھنا ہے
افسانہ لکھنا ہے۔ کیا لکھوں، کیا لکھوں، کیا لکھوں۔ معاً ایک بات سمجھ میں آتی ہے
مثلاً وہ درخت کے نیچے کھڑی تھی۔ پھر قلم رکھ دیتا ہوں، سگریٹ پیتا ہوں یا پیشاب
کرنے چلا جاتا ہوں یا پان کھانے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ واپس آ کر "وہ" سے
پوچھتا ہوں کہ بتا اب تو کیا کہتی ہے۔ وہ جو کچھ مجھ سے کہتی جاتی ہے۔ میں لکھتا
جاتا ہوں۔ وہ جدھر جاتی ہے میں اس کے ساتھ ساتھ جاتا ہوں، البتہ میں اسے
کنکھیوں سے دیکھتا جاتا ہوں کہ وہ شکل و صورت کے اعتبار سے کیسی ہے۔ اس
میں قابلِ غور کون کون سی باتیں ہیں۔ اس کے سینے کا اُبھار کیسا ہے۔ وہ جب ہنستی
ہے تو اس کے گالوں میں گڑھے پڑتے ہیں یا نہیں۔ وہ جب چلتی ہے تو اُس کا انداز کیا
ہوتا ہے۔ جب وہ مسکراتی ہے تو کہیں دل لوٹ کے تو نہیں لے جاتی ۔۔ یہ مرحلہ میرے
لیے نازک ہوتا ہے کہ جب وہ دل لوٹنے پر آتی ہے تو خود لٹتی بھی ہے یا نہیں۔ بس
اس کا علم مجھے نہیں ہوتا۔ جب افسانے کا آخری حصہ آتا ہے تو اُن تمام کرداروں
سے پوچھتا ہوں کہ بھئی اب بتاؤ تمھاری کیا کیا مرضی ہے؟ تم میں سے کس کس کو
مار دیا جائے یا تم میں سے کس کو کیا کر دیا جائے۔ بعض کردار مرنے سے انکار کر دیتے
ہیں۔ میں کہتا ہوں جاؤ تمھیں زندگی بخشی۔ پھر دوسرے کردار سے مشورہ کرتا ہوں
وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر صاد کر دیتا ہوں۔ ان میں سے جو کوئی مرنے کے لیے راضی
ہوتا ہے اُسے مار دیتا ہوں یا وہ سالا اور سالی جو کچھ بھی کرنا چاہے، میں اُسے مطلق نہیں
روکتا۔ البتہ آخری فقرہ منٹو سوچتا ہے اور افسانہ مکمل ہو جاتا ہے۔ مثلاً موذیل کا پہلا

فقرہ "ترلوچن نے پہلی مرتبہ — چار برسوں میں پہلی مرتبہ رات کو آسمان دیکھا تھا" میرا ہے اور پھر آخری فقرہ "لے جاؤ اپنے اس مذہب کو" میرا ہے۔ باقی سب کچھ موذیل کا ہے۔ پھر موذیل کے وجود پر بحث ہوگی "بمبئی میں ایک یہودن تھی۔ بڑی بڑی رانوں والی دھڑتے کی عورت، وہ اسکرٹ کے نیچے کچھ نہیں پہنتی تھی۔ افسانہ لکھتے وقت وہ دماغ میں اُبھری۔ اس کا نام بھول گیا تھا تو میں نے سوچا کہ ہمارے فلیٹ کے سامنے بھی تو ایک یہودن رہتی تھی اور اس کا نام موذیل تھا۔ اُدھر بڑی بڑی رانوں کا تصور ذہن میں اُبھرا۔ اِدھر موذیل کا نام، تو بس افسانہ ہوگیا۔ میرا اس میں کونسا کمال ہے۔ اگر کوئی کمال ہے تو موذیل کا ہے — آہ —

ویسے اس سلسلے میں منٹو صاحب نے جو کچھ تحریری طور پر فرمایا ہے۔ وہ بھی سُن لیجیے، مزے کی باتیں ہیں:

"اب آپ کو کیا بتاؤں کہ میں افسانہ کیونکر لکھتا ہوں۔ یہ بڑی اُلجھن کی بات ہے۔ اگر میں 'کس طرح' کو پیشِ نظر رکھوں تو یہ جواب دے سکتا ہوں کہ اپنے کمرے میں صوفے پر بیٹھ جاتا ہوں۔ کاغذ قلم پکڑتا ہوں اور بسم اللہ کرکے افسانہ لکھنا شروع کردیتا ہوں۔ میری تین بچیاں شور مچا رہی ہوتی ہیں میں اُن سے باتیں بھی کرتا ہوں، اُن کی تمام باہم لڑائیوں کا فیصلہ بھی کرتا ہوں۔ اپنے لیے سلاد بھی تیار کرتا ہوں۔ کوئی ملنے والا آجائے تو اس کی خاطرداری بھی کرتا ہوں۔ مگر افسانہ لکھے جاتا ہوں — میں افسانہ نہ لکھوں تو مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ میں نے کپڑے نہیں پہنے

یا میں نے غسل نہیں کیا — میں افسانہ نہیں لکھتا۔ حقیقت یہ ہے کہ
افسانہ مجھے لکھتا ہے۔ میں بہت کم پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ یوں تو میں نے
بیس سے اُوپر کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن مجھے بعض اوقات حیرت ہوتی ہے
کہ یہ کون ہے جس نے اس قدر اچھے افسانے لکھے ہیں جس پر آئے
دن مقدمے چلتے رہتے ہیں — جب قلم میرے ہاتھ میں نہ ہو تو میں صرف
سعادت حسن ہوتا ہوں جسے نہ اُردو آتی ہے نہ فارسی، نہ انگریزی، نہ
فرانسیسی — بعض اوقات میں بیوی کے کہنے پر قلم یا پنسل اُٹھاتا ہوں
اور لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ دماغ بالکل خالی ہوتا ہے۔ لیکن جیب
بھری ہوتی ہے۔ خود بخود کوئی افسانہ اُچھل کے باہر آجاتا ہے۔
میں خود کو اس لحاظ سے افسانہ نگار نہیں جیب کترا سمجھتا ہوں۔ جو
اپنی جیب خود ہی کاٹتا ہے اور آپ کے حوالے کر دیتا ہے —
مجھ ایسا بھی بیوقوف دنیا میں کوئی اور ہو گا؟"

ایک مرتبہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔ اس کا حال آپ نے منٹو صاحب کی زبانی سنا ہو گا۔ میرے اور اُن کے بیان میں بدیہی فرق یہ ہو گا کہ وہ ایک بڑے لکھنے والے ہیں اور میرا لکھنے والوں میں شمار ہی نہیں۔ الحمد للہ کہ میرا لکھنے والوں میں شمار نہیں، ورنہ میں بھی بعض اولوالعزم "ادبا و شعرا" کی طرح کسی کو خاطر میں نہ لاتا۔ ہر ادیب کے متعلق یہی کہتا کہ فلاں کیا لکھتا ہے۔ فلاں کی زبان ٹھیک نہیں۔ فلاں کا مشاہدہ ناقص ہے، فلاں جاہل ہے۔

[1] پانچواں مقدمہ

ایسے اساتذہ کی موجودگی میں کون کسی کے منہ لگے۔ ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ میں نے منٹو صاحب کی ضمانت دی۔

میرا منجھلا بھائی سخت بیمار تھا۔ میں اس کی دوائی کے سلسلے میں ڈاکٹر کے پاس آیا ہوا تھا اور اس کی کیفیت بیان کر رہا تھا، وہاں یہ پیغام ملا کہ ہاجرہ مسرور آئی ہیں اور آپ کو بلا رہی ہیں۔

میں نے سوچا کہ ایک خاتون دفتر میں بیٹھی نہ رہے۔ چل کر پہلے ان کی بات سن لوں۔ پھر دوائی لے جاؤں گا۔

ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ابھی آیا۔ میں اپنے بھائی کی بیماری سے سخت پریشان تھا۔ پھر بھی بر بنائے تکلف بہن سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ میں اصرار کر رہا تھا کہ میں آپ کو چائے پلاؤں گا اور وہ کہہ رہی تھیں کہ ہرگز ہرگز نہ پیوں گی اور طفیل کی چائے تو کبھی نہ پیوں گی کہ اتنے میں منٹو صاحب تشریف لے آئے۔ وہ تانگے میں سوار تھے۔ انھوں نے میری طرف اشارہ کر کے آواز دی "ذرا ادھر آنا"۔ میں ذرا اُدھر گیا، منٹو صاحب ذرا اِدھر آئے اور ہمارا آمنا سامنا دفتر اور سڑک کے درمیان ہوا۔ منٹو صاحب نے کہا کہ ذرا میرے ساتھ آؤ اور میری ضمانت دے دو۔ میں اپنے چند دوستوں کے پاس گیا تھا، اُن میں سے کوئی نہیں ملا۔ (اس وقت میرے لیے یہ فیصلہ مشکل تھا کہ یہ اس وقت مجھے اپنا دوست سمجھ کر آئے ہیں یا دشمن سمجھ کر) ساتھ ہی انھوں نے یہ بھی کہا کہ کُل پانچ ہزار روپے کی ضمانت ہے۔

میں نے یہ عذر کیا کہ میں تو گھر سے بھائی کی دوا لینے کے لیے آیا ہوں اس لیے

آپ یہ کام کسی او۔ کے سپرد کر دیں۔ بہت ممکن ہے کہ میری پانچ ہزار کی ضمانت بھی منظور نہ کی جائے۔

اس پر منٹو صاحب نے کہا کہ آپ آدھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے اور ساتھ ہی کئی سوال جڑ دیئے "آپ کا ذاتی مکان ہے؟ آپ کا بینک بیلنس تو اتنا ہوگا؟" جب میں نے نفی میں جواب دیا تو کہنے لگے "آجاؤ ہو جائے گی ضمانت، آخر اتنے بڑے ادارے کا مالک پانچ ہزار کی بھی ضمانت نہیں دے سکتا"

ہاجرہ بہن نے بھی لقمہ دیا "چلے جائیے نا آخر ہرج ہی کیا ہے"

چنانچہ دھڑکتے دل کے ساتھ اور گھریلو پریشانیاں لیے منٹو صاحب کے ساتھ تانگے میں بیٹھ گیا۔ تانگے میں نصیر انور اور حنیف رامے موجود تھے۔ اب تانگہ انارکلی سے نسبت روڈ پہنچا اور راستے میں باتیں ہو رہی ہیں "کل جو تھانیدار میرے وارنٹ لے کر آیا تھا۔ بڑا شریف آدمی تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ کل صبح خود تھانے میں اپنے ایک ضامن سمیت حاضر ہو جاؤں گا۔ اب آپ جائیں اور مجھے آرام کرنے دیں۔ چنانچہ انھوں نے میری بات مان لی اور میں رات بھر آرام کرتا رہا" کبھی نصیر انور کہتے "منٹو صاحب آپ ایسے افسانے کیوں لکھتے ہیں۔ جن پر مقدمے کی نوبت آئے" کبھی میں کہتا کہ منٹو صاحب اگر آپ کو وقت مقررہ پر حاضر عدالت ہونا ہے تو مجھ سے ضمانت دلوائیے ورنہ مجھے پریشان نہ کیجئے گا"

جس وقت ہم نسبت روڈ سے میکلوڈ روڈ پر پہنچے تو منٹو صاحب نے کہا "اگر اس وقت طفیل صاحب بھی نہ ملتے تو بڑی مشکل ہوتی اس پر نصیر انور نے کہا "آپ کی

مشکل تو حل ہو گئی۔ اب آپ طفیل صاحب کے لیے مشکل پیدا کر رہے ہیں"۔

اس پر منٹو صاحب ہنسے اور کہا "نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ آخر مجھے ایک بار تو کراچی جانا ہی ہے تاکہ یہ ٹنٹا ختم ہو"۔ اب تانگہ میکلوڈ روڈ سے قلعہ گوجر سنگھ کی طرف مڑا۔ بالآخر تانگہ ڈسٹرکٹ پولیس کے سامنے جا کر رُکا۔ ہم نے دفتر میں جا کر اپنی آمد کی غرض بتائی۔ وہاں میرے بھی ایک جاننے والے مل گئے۔ انھوں نے جب یہ سُنا کہ میں ایک ضمانت کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں تو انھوں نے کوشش کی کہ ضمانت جلد سے جلد ہو جائے۔ حالانکہ اس وقت میرا دل یہ چاہتا تھا کہ وہ کچھ ایسا ہیر پھیر کریں کہ تھانیدار صاحب میری ضمانت ہی قبول نہ کریں۔ وہ میرے دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر یہ اندازہ نہیں کر سکتے تھے کہ میں یہاں محض مروّت کی بنا پر آ گیا ہوں۔ اس لیے کہ مجھ سے ایک بڑے لکھنے والے کی دلآزاری نہیں دیکھی جاتی تھی۔

چنانچہ صاحب ضمانت ہو گئی۔ دوسرے لمحے منٹو صاحب نے فیصلہ سنا دیا کہ میں کراچی نہ جا سکوں گا اس لیے کہ صحت خراب ہے۔ ڈاکٹری سرٹیفکیٹ بھجوا دوں گا۔ اُن کے منہ سے اس وقت یہ فقرہ سُن کر میں حیران رہ گیا۔ اِس لیے کہ وہ کراچی نہیں جا رہے تھے۔ حیرانی اس لیے بھی ہوئی کہ میں نے ان کی صحت اُس دن سے اچھی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

اس وقت مجھے منٹو صاحب پر بڑا غصہ آیا۔ حالانکہ غصّہ مجھے اپنے اوپر آنا چاہیے تھا۔ بہ فرضِ محال اگر اس وقت مجھے اپنے اُوپر غصّہ آ بھی جاتا تو کیا ہوتا۔ بالآخر تانگے پر پھر سوار ہوئے اور تانگے کا رُخ ہمارے دفتر کی طرف کرا دیا گیا۔ راستے میں پاکستان ٹائمز اور امروز کا دفتر آیا تو تانگہ رُکوا دیا گیا۔ اُوپر پہنچے جس کسی نے سُنا کہ میں نے منٹو صاحب

کی ضمانت دی ہے تو سب نے یہی کہا کہ منٹو صاحب وقتِ مقررہ پر حاضرِ عدالت نہ ہوں گے
منٹو صاحب ان ریمارکس پر ہنستے رہے اور کہتے رہے "نہیں یار! کیوں نہ جاؤں گا۔
حالانکہ وہ اس سے پہلے مجھے کہہ چکے تھے کہ نہیں جاؤں گا۔"

بالآخر ایک بات میرے ذہن میں آئی اور میں نے منٹو صاحب سے کہا "اگر میں کل صبح کے لیے دو سیٹیں بک کرا دوں۔ تو کیا آپ اور نصیر انور کراچی چلے جائیں گے؟" منٹو صاحب نے میری اس پیشکش کو قدرے تکلّف کے ساتھ قبول کر لیا۔ بعد ازاں منٹو صاحب سے گزارش کی گئی کہ آپ گھر تشریف لے جائیں۔ میں سیٹیں بک کرانے کا بندوبست کرتا ہوں۔

چنانچہ پاکستان ٹائمز کے دفتر سے اپنے دفتر تک پیدل آیا۔ اپنی سائیکل سنبھالی سائیکل پر سوار ہوا تو بھائی کی بیماری اور اس کی دوا پھر یاد آ گئی۔ سائیکل کے پہیے کے ساتھ میرا دماغ بھی گھومنے لگا۔

سیٹیں بک کرانے میں بڑی دشواری ہوئی۔ ریزرویشن آفس سے معلوم ہوا کہ چار دن تک کوئی سیٹ خالی نہیں۔ اِدھر دقّت یہ تھی کہ منٹو صاحب کی دوسرے دن عدالت میں حاضری تھی۔ چنانچہ شوکت تھانوی صاحب کے پاس ریڈیو اسٹیشن پہنچا۔ انھوں نے پہلے تو خوب سخت سست کہا۔ لیکن پھر یہ انتظام کرا دیا کہ اگر ہم کل صبح سات بجے اسٹیشن پر پہنچ جائیں تو سیٹوں کا انتظام ہو جائے گا۔

میں نے اس کی اطلاع منٹو صاحب کو دے دی اور ان کی بیگم اور ہمشیرہ سے بھی کہا کہ انھیں صبح تک تیار کر دیجیے گا تاکہ میری ذمہ داری ختم ہو۔

رات کو جب گھر پہنچا تو گھر والوں نے شکایت کی کہ بھائی اتنا بیمار ہے اور تمہیں دوا تک پہنچانے کی فرصت نہیں۔ مجھے بڑی ندامت ہوئی۔ لیکن میں ان سے کیا کہتا کہ مجھ پر آج کیا بیتی ہے۔ رات بھر کبھی بھائی کی بیماری کا خیال آتا رہا۔ کبھی منٹو صاحب کی کرم فرمائیوں کا۔ یہ بھی عجیب بات ہے کہ میں ایسے مواقع پر بجائے اختر شماری کے زخم شماری کرتا ہوں۔ چنانچہ رات بھر یہ مشغلہ جاری رہا۔ صبح ۵ بجے گھر سے چل نکلا۔ گھر والے میری شب بیداری سے ہی کافی پریشان تھے۔ جب علی الصبح گھر سے نکلا تو وہ اور پریشان ہو گئے۔ اس لیے کہ میں سردیوں میں رات کے گیارہ بجے سے پہلے سونے کا اور صبح ۹ بجے سے پہلے اُٹھنے کا عادی نہ تھا۔

اُن کے استفسار پر میں نے صرف اتنا کہا کہ میرا ایک دوست کراچی جا رہا ہے اسے اسٹیشن تک چھوڑنے جا رہا ہوں۔ ابھی آجاؤں گا اور بھائی کی دوا بھی لاؤں گا۔ جب بھاٹی دروازے کے باہر پہنچا تو سوچا کہ تانگے میں بیٹھ کر منٹو صاحب کے ہاں پہنچوں۔ پھر خیال آیا میں بہت سویرے جا رہا ہوں، جلدی پہنچ گیا تو منٹو صاحب کو تکلیف ہوگی۔ اُدھر یہ بھی دھڑکا، اگر میں نے جلدی پہنچنے میں ذرا سی غفلت کی تو منٹو صاحب گھر سے بھاگ جائیں گے، پیدل ہی چل نکلا۔ اپنے بجائے ان کی تکلیف کا زیادہ خیال رہا۔

راستے میں کتوں نے بھی بھونک کر استقبال کیا۔ سوچتے ہوں گے کہ اس شکل و صورت کا انسان آج اِدھر کیسے۔ ایک آدھ جگہ بھنگی نے بھی سڑک صاف کرتے ہوئے کہا "ہٹ جاؤ بابو جی"۔ اُس وقت بڑا جی چاہا کہ ذرا اس کے پاس رکوں۔ اس کی خیریت اور اس کے بال بچوں کا احوال پوچھوں۔ پھر نہ جانے ہمت کیوں نہ ہوئی۔

اس کے باوجود جب منٹو صاحب کے مکان پر پہنچا ہوں تو کافی سویرا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ ان کی بیگم نے دروازہ کھولا، منٹو صاحب کو جگایا تو منٹو صاحب آنکھیں ملتے ہوئے آئے اور السلام علیکم سے استقبال کیا۔ اس وقت ان کے گلے میں ایک بڑی گرم چادر لپٹی ہوئی تھی، جیسے مفلر لپیٹا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد نصیر انور بھی آ پہنچے۔ تانگہ منگوایا گیا۔ ان کی ہمشیرہ، بیگم اور بچیوں نے ہمیں وداع کیا اور خیریت سے واپسی کی دعا مانگی۔

اسٹیشن پر سیٹوں کا انتظام ہو چکا تھا۔ جب سامان گاڑی میں رکھ دیا گیا تو منٹو صاحب نے شراب کی بوتلوں کو نکال کر ایسی جگہ رکھ دیا، جہاں ہر آتے جاتے کی نظر پڑتی تھی۔ میں نے منٹو صاحب سے کہا ایسا نہ کیجئے۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹی سی سبز رنگ کی کاپی نکال کر دکھائی کہ میرے پاس شراب کا پرمٹ ہے۔ یہ بات ان کے منہ ہی میں تھی کہ گاڑی چلی چھک چھک چھک چھک۔

دوسرے دن اخبار میں آیا کہ منٹو صاحب عدالت میں حاضر ہو گئے تو جان میں جان آئی۔

ایک وقت منٹو صاحب پر یہ بھی آیا کہ جب وہ ایک دم بیٹھے بٹھائے کہنے لگے "ارے بھئی سنو تنا تن تنا تن تنا توم تنا توم" (پتہ نہیں کیا الا بلا) جو صاحب منٹو صاحب کے پاس بیٹھے ہیں۔ وہ پریشان کہ ایک دم انھیں کیا ہو گیا۔ ادھر سے استفسار ہو گا کیا نہیں منٹو صاحب کہیں گے ریڈیو، ارے بھئی کہاں ہے؟ جواب ملے گا ادھر آؤ اور میرے کانوں کے ساتھ اپنے کان لگا دو۔ آ رہی ہے نا آواز۔ واہ وا کیا گلا پایا ہے کمبخت نے

پھر ہاتھ کے اشاروں سے سُر کے اُتار چڑھاؤ کا ساتھ دیں گے۔ کبھی کبھی اُٹھ بیٹھیں گے اور کبھی کھڑے کھڑے بیٹھ جائیں گے۔ ساتھ ہی تبصرہ بھی۔ "ہائے ظالم نے مار ڈالا۔ یا ظالمی نے مار ڈالا۔ واہ وا، بھئی واہ وا، شاباش، ہائے —" اگر اس وقت شرارت سے کسی نے کہہ دیا کہ منٹو صاحب جو کچھ آپ سن رہے ہیں وہ ہمیں سنائی نہیں دیتا اس لیے ہمیں کاغذ پر لکھ کر بتاتے جائیے تو وہ کاغذ اور قلم سنبھالتے ہوئے یہ مشورہ بھی دیں گے کہ کانوں میں تیل ڈالا کرو اور سر کی مالش کرایا کرو۔ اور ساتھ ہی لکھنا شروع کر دیں گے۔ پہلے دو تین پنجابی گیت لکھیں گے، پھر کہیں گے "اب اردو کے گانے سنیئے"۔ وہ بھی تین چار لکھ ڈالیں گے —۔ یہ ریڈیو دو تین مہینے تک منٹو صاحب کے کانوں میں بجتا رہا۔ جسے صرف ان کی اکیلی جان سنتی رہی اور لوگوں کو یہ لکھ کر یا خود سنا کر سناتے رہے۔ پھر نہ جانے کیوں ان کے کان کے ریڈیو کے والو خراب ہو گئے اور ریڈیو بجنا بند ہو گیا۔

انہی دنوں کا ذکر ہے کہ ایک دن شام کے قریب ان کے گھر گیا تو باہر سے دیکھا کہ منٹو صاحب گا رہے ہیں کبھی ہاتھوں کو کانوں تک لے جا رہے ہیں اور کبھی سُر کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو نچا رہے ہیں۔ میں باہر کھڑا کافی دیر تک یہ تماشا دیکھتا رہا۔ آخر تابِ کے "تنگ" آ کر آواز دی۔ اُن کا نوکر باہر آیا تو میں نے کہا۔ "ذرا منٹو صاحب کو بلا دیجئے"۔ اس نے جا کر منٹو صاحب سے کہا کہ کوئی صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔ منٹو صاحب نے جواب دیا۔ "ان سے جا کر کہہ دو اس وقت منٹو صاحب نہیں آ سکتے، گانا گا رہے ہیں۔"

پھر خود ہی چلے آئے اور دروازہ کے قریب آ کر عینک کو ٹھیک کرتے ہوئے

کہا "کون ہے؟" اچھا آپ میں بھی معاف کرنا میں اس وقت گا رہا تھا۔ آؤ تم بھی گانا سنو۔"
میں نے پوچھا اور کون کون ہے؟" کہنے لگے "کوئی نہیں ہے۔ گھر ہی کے کچھ لوگ ہیں۔ آؤ، آؤ، آؤ۔"

مقدموں کی بھرمار نے اب انھیں سنبھلنے پر مجبور کر دیا ہے لیکن مصیبت یہ ہے کہ اب ان سے افسانے نہیں سنبھلتے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس عرصے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بحیثیت مجموعی ان کی ناکام تحریریں ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ افسانہ بعد میں لکھتا ہوں۔ مقدمہ پہلے چل جاتا ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ جی چاہتا ہے لکھنا وکھنا چھوڑ دوں اور پاکستان اور ہندوستان سے دور کہیں چلا جاؤں۔ وہاں بیٹھ کر خوب جی کھول کے افسانے لکھوں۔ اشاعت کے لیے انھیں یہاں بھجوا دوں تاکہ سارے پبلشر اندر ہو جائیں۔ اپنی تو جان چھوٹے۔ میں سفید کو سفید کہنے پر مجبور رہوں۔ حکم ہوتا ہے کہ نہیں سفید کو سیاہ کہو۔ سیاہ کو سفید کہو۔ اگر سیاہ اور سفید دونوں نظر آ رہے ہوں تو کچھ نہ کہو چپ رہو۔ پگھلا ہوا سیسہ نگل لو۔ یا خودکشی کر لو ــــ پھر مجھے جو سزائیں ملتی ہیں وہ بھی انگریز بہادر کے زمانے کی۔ میں تو ایک ہی طرح کی سزائیں بھگت بھگت کے بور ہو چکا ہوں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ مملکتِ پاکستان میں مجھے اسلامی سزائیں ملتیں تاکہ ورائٹی ہی کی وجہ سے دل کو ڈھارس رہتی۔ لیکن یہاں تو معاملہ وہی ہے کہ جو تھا۔ انگریز بڑی سیانی قوم ہے وہ یہاں سے اپنا جسم بچا کر لے گئی ہے لیکن اپنی روح چھوڑ گئی ہے۔ بعض اوقات میرا جی چاہتا ہے کہ ایک ہیپ ٹلا (یہ ان کا خاص لفظ ہے) قسم کا افسانہ لکھوں جس میں سماج اور مملکت کے تمام ناسوروں کو ایک ساتھ چھیڑ دوں۔ خوب خوب نشتر زنی کروں اس کے بعد پھر پونے مکہ پاشی کر دوں۔ انجام کار اپنے آپ کو گولی مار دوں اور یہ سمجھ لوں کہ مقصد ادا ہو گیا۔

منٹو صاحب پنجابی بولنے میں بڑی آسانی محسوس کرتے ہیں جب انھیں شبہ ہو جائے کہ مخاطب تو اہلِ زبان ہے تو ان سے استفسار کریں گے۔

"آپ پنجابی سمجھتے ہیں نا" ظاہر ہے کہ مخاطب نہ سمجھتے ہوئے بھی اثبات میں سر ہلائے گا۔ اور اُردو میں جواب دے گا کہ بول نہیں پاتا، سمجھ تو لیتا ہوں۔

اس پر منٹو صاحب کہیں گے "معاف کیجئے گا جب میں اُردو بولتا ہوں۔ تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے میرا منہ پک گیا ہے یا پک رہا ہے۔ اُردو بولتے ہوئے میرے جبڑے دُکھنے لگتے ہیں۔ تالو اور زبان کے نیچے جو جگہ ہے وہ مجھے چٹاپ چٹاپ کرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے میرے بھائی معاف کرنا، میں پنجابی ہی میں بات کروں گا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے اُردو سے کوئی بیر ہے۔ سوچتا ہوں کہ جب لکھتا اُردو میں ہوں تو پنجابی میں باتیں کروں۔ اگر آپ چاہیں تو میں اُردو میں بھی باتیں کرکے اپنے آپ کو مصیبت میں ڈال سکتا ہوں۔

منٹو صاحب عموماً گھر میں ملتے ہیں یا تانگے میں ہوتے ہیں۔ کسی تانگے کی پچھلی سیٹ پر دُور سے کوئی بیمار لیٹا ہوا نظر آئے۔ جو اُلٹے رُخ ٹیک لگا کے لیٹا ہو، تو فوراً کوئی رائے قائم نہ کر بیٹھیے گا۔ تانگے کے قریب آنے کا انتظار کر بیٹھیے گا۔ بہت ممکن ہے وہ منٹو صاحب ہوں۔ اگر ان کے دو ایک ہم بوتل وہم گلاس ساتھ ہوں تو وہ اگلی سیٹ پر بیٹھیں گے اور اپنے اُن قدر دانوں سے کہتے جائیں گے کہ میں ایک بہت بڑا افسانہ لکھنا چاہتا ہوں لیکن ڈرتا ہوں کہ مقدمہ چل جائے گا۔ اگر مقدمہ نہ چلا تو مجھے دکھ ہوگا۔ اس لیے کہ میرے ذہن میں خواہ مخواہ یہ آئے گا کہ اپنی حکومت تو فرائض منصبی سے بھی بیگانہ ہو گئی۔

یا مجھے یہ سوچنا پڑے گا کہ وہ افسانہ بڑا ہی تھرڈ کلاس ہے ورنہ حکومت ضرور ایکشن لیتی۔
منٹو صاحب میں ذاتی طور پر بڑی خوبیاں ہیں۔ لیکن شراب نے اُن میں کئی کمزوریاں پیدا کر دی ہیں پہلے مجھے اُن پر غصہ آتا تھا۔ اب ترس آتا ہے۔ میں تو اُن کے فن پر اُن کی تمام کمزوریوں کو نثار کر سکتا ہوں۔ کسی اور کا حال خدا جانے۔

(۳)

عمر کے آخری دنوں میں مرحوم یہ چاہتے تھے کہ ان کی زندگی ہی میں ان پر کوئی اچھا رسالہ نمبر چھاپ دے۔ اس سلسلے میں اوروں کے پاس بھی گئے ہوں گے میرے پاس بھی آئے اور جو میری اور ان کی اس سلسلے میں گفتگو ہوئی تھی۔ وہ مندرجہ ذیل ہے:

"یار منٹو نمبر نکالو۔"

"جی!"

"میں کہتا ہوں نقوش کا منٹو نمبر نکالو۔"

"آج یہ آپ کیسی باتیں ـــــ"

"تمہارا خیال یہ ہے کہ میں نشہ میں ہوں اور بکواس کر رہا ہوں۔"

"آخر اتنی جلدی کیا ہے۔ چھپ جائے گا۔"

"میں اس کا انتظار نہیں کر سکتا کہ پہلے مر کے دکھاؤں۔ پھر نمبر چھپے۔"

"مرنے کا نام نہ لیجئے۔ ابھی آپ کی بڑی ـــــ"

"اب جی کر بھی کیا کروں گا۔ اب تو میں خود مرنے پر راضی ہو گیا ہوں۔"

"اچھا! یہ بتائیے اس نمبر میں کیا کیا ہوگا؟"

"اب تک مجھے جتنی گالیاں ملی ہیں، وہ سب سے پہلے چھپیں گی اور جتنے بیوقوفوں نے میری تعریف کی ہے وہ سب سے آخر میں چھپے گی۔ بیچ میں میرے تین چار غیر مطبوعہ افسانے اور اسکیچ ہوں گے۔ بہرحال تمھیں زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ نمبر تمھیں میں مرتب کر دوں گا۔"

"اگر آپ مرتب کر دیں گے تو میں کیا کروں گا؟"

"تم جھک مارنا۔"

"اس صورت میں تو آپ خود ہی ایک مجموعہ مرتب کرلیں اور اسے کتابی صورت میں چھاپ لیں۔"

"میں چاہتا ہوں، نقوش کا منٹو نمبر نکلے۔"

"تو پھر آپ کا اس نمبر کی ترتیب و تدوین سے کوئی تعلق نہ ہوگا۔ میں کسی کی رائے تک برداشت نہیں کرسکتا۔"

"تو اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے۔ کیا تو مجھ سے زیادہ قابل ہے"

"قابلیت کو چھوڑیئے۔ یہ معاملہ ذمہ داری کا ہے۔"

"ذمہ داری کو چھوڑو۔ یہ معاملہ قابلیت کا ہے۔"

"اس معاملہ میں مجھے آپ کی قابلیت سے انکار ہے۔"

"اچھا تو تم پھر جیسی میری دُرگت بنانی چاہتے ہو میری زندگی ہی میں بنا ڈالو۔"

منٹو کے انتقال کو ادیبوں نے ایک ادبی حادثہ قرار دیا۔ یہ بات ہے بھی ٹھیک، اس لیے کہ اُس نے افسانوی ادب کو اتنا کچھ دیا ہے کہ اُسے کبھی فراموش نہ کیا جاسکے گا۔

نہ اب نہ جب،

میں نے بھی دوسرے رسالوں کی طرح نقوش کا منٹو نمبر نکالا۔ جو اپنی جامعیت کے اعتبار سے دیگر رسائل سے بہتر تسلیم کیا گیا۔ اُس میں مرحوم کی بیس تو غیر مطبوعہ کہانیاں تھیں دس نمائندہ افسانوں کا انتخاب بھی مرحوم کا اپنا تھا۔ فن پر لکھنے والوں میں ممتاز شیریں، وقار عظیم، محمد حسن عسکری، عابد علی عابد، ابو اللیث صدیقی، عبادت بریلوی اور ممتاز حسین تھے۔
شخصیت پر لکھنے والوں میں عصمت چغتائی، اوپندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، ہاجرہ مسرور ابو سعید قریشی، حامد جلال، غلام عباس اور راقم الحروف تھے۔

منٹو نمبر پر تبصرہ کرنا میرے فرائض میں شامل نہیں ایک بات کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں۔

جب میں نے منٹو نمبر کے لیے مضامین فراہم کرنے شروع کیے تو قدرت اللہ شہاب کو بھی دعوت دی۔ جسے انھوں نے منظور کرتے ہوئے یہ لکھا کہ "مضمون جلد بھیجدوں گا اور وہ ایک خط کی صورت میں ہوگا۔ جو منٹو آپ کو عالمِ بالا سے لکھیں گے۔" یہ خیال مجھے پسند آیا۔ اس لیے کہ اس میں منٹو کی پوری شخصیت آسکتی تھی۔ اور وہ تمام مسائل بھی آسکتے تھے، جو منٹو سے متعلق ہو سکتے تھے۔

جب شہاب صاحب اپنی مصروفیات کی بنا پر وقت نہ نکال سکے، تو میں نے اسی انداز میں جو کچھ لکھا۔ اُسے یہاں پیش کرتا ہوں۔ جو "منٹو کا ایک خط" کے نام سے منٹو نمبر میں چھپ چکا ہے۔ اس خط میں میں نے کوشش کی تھی کہ منٹو کا اسلوب بھی آسکے — کامیابی خدا معلوم!

برادرم، السلام علیکم!

مجھے یہاں آئے ہوئے ساڑھے تین مہینے گزر چکے ہیں لیکن میں تمہیں اپنی خیریت کا خط تک نہ لکھ سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ماحول میرے لیے نیا تھا۔ بہرحال اُس ماحول سے یقیناً بہتر ہے جس میں میں نے ۴۲ برس تک جھک ماری تھی ــــ وہاں جب تک رہا سُولی پہ لٹکتا رہا۔

جب سے یہاں آیا ہوں، نہ صفیہ نے مجھ سے کوئی فرمائش کی ہے اور نہ ہی نکہت، نزہت اور نصرت میں سے کسی نے، ورنہ اکثر یہ ہوتا تھا۔ ابّا فلاں چیز لا دو، فلاں چیز لا دو۔ تمہیں تو علم ہے کہ مجھے اپنی بچیوں سے بے انتہا محبت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ان کی فرمائش اپنی تنگدستی کی بنا پر پوری نہیں کر پاتا تھا۔ تو خون کے آنسو رویا کرتا تھا۔ حتیٰ کہ بعض منحوس سال ایسے بھی آئے تھے کہ بچی کی سالگرہ تھی اور جیب میں پھوٹی کوڑی نہیں۔

ایسے ماحول میں میں کب تک رہ سکتا تھا۔ قدرت تو مجھے ایسے انسان کُش ماحول میں اور رکھنا چاہتی تھی لیکن میں نے خود ایسے وسائل اختیار کر لیے تھے کہ آپ کے جہنم زار سے نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔

میں جب تک وہاں رہا۔ آپ لوگوں ہی کے غموں میں گُھلتا رہا۔ نہ صرف گُھلتا رہا۔ بلکہ آہستہ آہستہ معدوم ہی ہو رہا تھا۔

یہاں ہر وقت یہی دعا کیا کرتا ہوں کہ یہ زندگی میرے تمام ہمعصر افسانہ نگاروں کو جلد نصیب ہو۔ اس لیے کہ وہاں رہ کر میں نے جیسی ان کی زندگی بسر ہوتے دیکھی تھی۔ وہ تو مجھ سے بھی بدتر تھی۔ جب مجھی کو وہاں سے آنا پڑا تو نہ جانے وہ کیوں ٹکے ہوئے ہیں۔

آپ کے تمام لکھنے والوں سے تعلقات ہیں، جو لاہور میں موجود ہیں۔ اُن سے زبانی کہہ دیں۔ جو لاہور سے باہر ہیں۔ انھیں بذریعہ خط مطلع کر دیں کہ وہ سب کے سب بیوی بچوں سمیت میرے پاس آجائیں۔ میں نے یہاں ابتدائی معاملات طے کر لیے ہیں۔ اس لیے کسی کو تکلیف نہ ہوگی۔

زمانے نے نہ میری قدر کی اور نہ دوسرے اہلِ قلم کی تمھیں علم ہے اگر ہم لوگ ہی تمھارے ہاں نہ ہوتے تو سوائے علم، ادب اور آرٹ کے سب کچھ ہوتا۔

یہاں جو بھی پہنچ گیا ہے مزے میں ہے اکثر قلمکاروں سے ملاقات رہتی ہے۔ سب میری ہی طرح پھولے بیٹھے ہیں۔ بعض نے تو تمھارے نمائش آباد کی شان میں ایسی ایسی ہجو یات سپردِ قلم کی ہیں کہ جب تک کلیجہ کو دونوں ہاتھوں سے نہ تھام لیا جائے سنی ہی نہیں جا سکتیں۔ اگر وہ چھپ گئیں تو تمھارے ہاں کے بعض سرپھرے سر بازار پیٹیں گے۔

بہرحال ہجویات کا وہ مجموعہ جب بھی شائع ہوا تمھیں اس کا ایک نسخہ ضرور بھیجوں گا۔ نقوش میں اُس پر تبصرہ کر دینا۔

تمھارے ہاں کے ادیب اور تمھارے پڑوسی ملک کے ادیب اپنے اپنے ناخداؤں سے جو بڑی خوشگوار قسم کی امیدیں وابستہ کیے بیٹھے ہیں۔ وہ سراسر حماقت ہے۔ ان خوشگوار قسم کی امیدوں کے پیٹ میں تو صرف حسن خوش فہمی لمبی تانے سو رہی ہے۔

تمھارے ہاں کی سیاست تو بڑی دھڑن تختہ قسم کی ہے۔ آج کوئی وزیر ہے۔ تو کل جیل میں ہے۔ اگر کوئی چند دن پہلے جیل میں تھا اور ساتھ ہی غدارِ وطن بھی تو آناً فاناً

وزیر ہو جاتا ہے۔ یہاں پر میرے احباب جب تمہارے ہاں کی سیاست کے بارے
میں گفتگو کرتے ہیں تو یقین جاننا۔ میں مارے شرم کے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔

تمہیں علم ہے کہ مجھ پر آپ کے ہاں پانچ مقدمے صرف فحاشی کے جرم میں چلے
تھے۔ حالانکہ میں نے کوئی فحش تحریر نہیں لکھی تھی۔ اس ضمن میں مجھ پر کیا کیا ستم نہیں ڈھائے
گئے تھے۔ کبھی وارنٹ نکلے، کبھی گرفتار ہوا۔ کبھی دوستوں سے ادھار مانگ کر جرمانہ ادا
کیا۔ اس کے باوجود میں نے انصاف زندہ باد کا نعرہ لگایا تھا۔ اگر میں کچھ دن اور وہاں
رہ جاتا تو بہت ممکن تھا۔ مجھ پر قتل، ڈاکہ زنی اور زنا بالجبر کے جھوٹے مقدمے بنا دیئے
جاتے۔ جہاں ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہو، وہاں کون مسخرہ رہے۔

اگر حکومت کے عتاب سے بچ جائیں تو نقاد پیچھا نہیں چھوڑتے۔ تم تو جانتے ہی
ہو کہ میں ساری عمر نقادوں سے دُور بھاگا ہوں۔ یہ بھی صحیح ہے کہ بعض نقاد بھی مجھ سے
دُور بھاگتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ وہ ہیں جو بگڑے ہوئے افسانہ نویس اور بگڑے ہوئے
شاعر ہوتے ہیں۔ یہ لوگ جب تخلیق کی قوت سے محروم ہو جاتے ہیں تو تنقید میں علامہ بن
جاتے ہیں۔ مجھے ان سب سے خدا واسطے کا بیر رہا ہے۔ اس لیے کہ جب یہ قلم ہاتھ
میں لے کر بیٹھتے ہیں تو اچھی بھلی چیز میں سو سو عیب نکالتے ہیں۔ لیکن ان حضرات کو
اپنی تحریر کے عیوب کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ خدا کے لیے مجھے ان بے تحاشا لکھنے پڑھنے
سے بچانا۔ ایسا نہ ہو کہ میرے موجود نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے اپنے قلم تیز
کریں اور میرے فن کی دوشیزگی کا جھٹکا کر دیں۔

آج ادب جبھی ترقی کرے گا کہ جو نقاد کہے اُس کا اُلٹا کیا جائے۔ نقادوں کا

منشا بھی یہی ہوتا ہے لیکن اسے میرے سوا سمجھا کوئی نہیں۔

کاش مجھے یہاں کوئی نقاد مل جائے تاکہ میں اُس سے تنقیدی بحث کر سکوں۔ تنقیدی بحث کرتے ہوئے اگر کسی نے اِن تین لفظوں کا صحیح استعمال کر لیا تو سمجھ لیجیے بازی لے گیا۔ وہ تین الفاظ یہ ہیں۔ اگر، مگر اور لیکن۔

جب تک نقاد تخلیق کی قوتوں سے مالا مال نہ ہوں گے۔ ان کی تحریروں میں نہ توازن پیدا ہوگا اور نہ واقعیت کے ساتھ خلوص۔ جب فن کار کے دل کے ساتھ نقاد کا بھی دل دھڑکے گا تو پھر جو کچھ لکھا جائے گا اُس پر ایمان لانا پڑے گا۔[1]

یہاں شراب طہور عام ہے۔ پانی نہ پیجیے شراب طہور نوش کر لیجیے۔ تمہارے ہاں تو بڑی تھرڈ کلاس قسم کی شراب ملتی تھی اور اس جگر پاش شراب کے لیے بھی مجھے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے تھے۔ بعض اوقات اس نامراد کے لیے ذلیل تک ہوا۔ دوستوں میں میری عزت نہ رہی۔ جدھر جاتا تھا۔ احباب منہ موڑ لیتے تھے۔ راستہ تک چھوڑ کر انجان بن جاتے تھے۔ اگر کسی سے مڈبھیڑ ہو جاتی تو وہ میرے منہ پر جھوٹی قسمیں کھا کھا کر کہتا تھا کہ میری جیب میں دھیلا تک نہیں۔ حالانکہ میں جانتا تھا کہ جیب میں دھیلا چھوڑ اتنے روپے ہیں کہ وہ مجھے اس خانہ خراب کی کئی بوتلیں خرید کر دے سکتا ہے۔ میں شراب کو خانہ خراب اس لیے کہتا ہوں کہ اس کی بنا پر کئی بار خانہ میں خرابی پیدا

---

[1] نقادوں کے بارے میں منٹو کے جو خیالات ہیں، مجھے اُن سے اتفاق نہیں، لیکن مجھے ان کی رائے کے سلسلے میں خود کوئی ترمیم کرنے کا حق بھی نہیں۔

ہوئی تھی ۔

ایک بڑی خطرناک مگر راز کی بات کہتا ہوں۔ اس کا ذکر کسی سے نہ کرنا ورنہ پٹو گے۔ یہاں جتنی لڑکیاں ہیں، وہ سب ہزاروں برس پرانی ہیں۔ لیکن ان کمبختوں کا جسم اور بانکپن تقدس توڑ ہے۔ اس مسئلہ پر تم سے بات کرنا قطعی حماقت ہے۔ اس لیے کہ تم اس مسئلے میں نرے چغد واقع ہوئے ہو۔ تمھاری چغدیت کا احترام کرنے کے باوجود میں یہ کہوں گا کہ ان سب میں ایسی پُروقار کشش اور سپردگی سی پائی جاتی ہے کہ تمھارے ہاں کی لڑکیاں ان کے سامنے بالکل بکواس ہیں۔

یہاں ایسے ایسے جمال آور لڑکے بھی ہیں کہ تمھارے ہاں کا کوئی شاعر اور ادیب دیکھ لے تو اُس کمبخت کے بے ہوش ہونے کے قطعی امکانات موجود ہیں بہت ممکن ہے۔ جانبر ہی نہ ہو سکے۔

میں ساری عمر ادبی تخلیقات کے سلسلے میں اپنے ہمعصروں سے شرمندہ نہیں ہوا تھا۔ اس لیے بھی کہ میرے مقابلے ہی کا کون تھا۔ لیکن یہاں آیا تو غالب نے بڑا پریشان کیا۔ بڑا پھبتی باز ہے" کہنے لگا" تو تو میرا چور ہے۔ میرے شعروں سے تو نے اپنے افسانوں کے عنوان چُنے۔ کتابوں کے نام تک جب نہ سُوجھے تو میرے شعروں کو دھر رگڑا اور محسن کشی ایسی کہ میرے بارے میں جو فلمی کہانی لکھی اُس میں بجائے میری شکر گزاری کے اظہار کے میری کسی خوبی کا ذکر تک نہیں کیا۔ بلکہ اُلٹی میری کمزوریاں گنوا کے رکھ دیں کہ میں بڑا دہ تھا، رنڈی باز تھا، جوا کھیلتا تھا اور اُس کی پاداش میں جیل تک ہوگئی تھی"۔ وغیرہ وغیرہ۔

تمھیں علم ہے کہ میں تمام لکھنے والوں میں صرف غالب ہی کو تو مانتا تھا۔ جب اُس نے

بھی مجھ سے ایسی ایسی باتیں کیں تو میں نے دل میں کہا لعنت ہو سعادت حسن منٹو تمہاری حقیقت نگاری پر۔

لیکن غالب ہے بڑا زندہ دل قسم کا انسان میری اتنی زیادتی کے باوجود گاڑھی چھنتی ہے۔ ہم اکثر ایک ساتھ پیتے ہیں اور پیتے ہی میں جب ہم حقیقت آشنا ہو جاتے ہیں اور ہماری انا بیدار ہوتی ہے تو غالب کہتا ہے "میں تم سے بڑا افسانہ نگار ہو سکتا تھا لیکن میں نے اسے فضول چیز سمجھ کر ہاتھ ہی نہیں لگایا تھا" اور میں اُس سے کہتا ہوں "شعر کہنا کونسا کمال ہے مرزا صاحب میری تو نثر کی ہر ہر سطر میں ایک شعر کیا پوری غزل کی غزل پنہاں ہوتی ہے ـــ" بات دونوں کی غلط ہے۔ اس کا علم اسے بھی ہے اور مجھے بھی۔ لیکن ہم اپنی اپنی انا کا کیا کریں۔

یہ چچا سام کا دبدبہ تو تمہارے ہاں دن دونی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے۔ مبارک ہو!

بڑوں کی عزت ضرور کرنی چاہیے لیکن سعادت مندی کے معنی یہ بالکل نہیں کہ تم اپنی ننھی سی جان بھی خطرے میں ڈال دو۔ میں نے یہ خبر بد بھی سُنی ہے کہ اب تو تمہارے ہاں کا سارا کام وہی کرتے ہیں اور تم سب اُلوؤں کی طرح ہاتھ پر ہاتھ رکھے اندھیرے کے منتظر ہو۔ اتنی تن آسانی اچھی نہیں ورنہ پچھتاؤ گے ـــ حتیٰ کہ تم لوگوں نے اپنی خودداری تک کو قفل لگا کے الماریوں میں رکھ دیا ہے۔

مصیبت یہ ہے کہ میں یہاں سے چچا سام کے نام کوئی خط نہیں لکھ سکتا۔ ورنہ میں اُن سے اپنی حدود میں رہنے کی درخواست ضرور کرتا۔ دعا کرو کہ وہ خود ہی

میرے پاس جلد سے جلد آجائیں تاکہ تمہاری جان چھوٹے۔ میں ان سے نمٹ ہی لوں گا۔ فراڈ کو فراڈ ہی پچھاڑ سکتا ہے۔

میں نے یہ بھی سنا ہے کہ جب سے یہاں آیا ہوں تمہارے ہاں میرا سوگ منایا گیا۔ خدا کی قسم یہ سنتے ہی میرا دل کباب ہوگیا۔ اس لیے کہ جب تک میں رہا۔ سب نے مل جل کر مجھے اپنے ہاں سے دور کرنا چاہا جب یہاں کچھ دوسروں کی اور کچھ اپنی مرضی سے آگیا ہوں تو ریڈیو پر اس ناچیز کی گمشدگی کے اعلانات کیوں کیے جاتے ہیں۔ یہ وہی ریڈیو والے ہیں جو مجھے اپنے ہاں گھسنے تک نہیں دیتے تھے۔ رسالے اور اخبار والے بھی میرے روپوش ہونے پر خصوصی ماتم کر رہے ہیں۔ ان کا بھی میرے ساتھ یوسف کے بھائیوں ایسا سلوک تھا۔ ان حالات میں تم سب کو اپنے اس منافقانہ رویہ پر شرم آنی چاہیے۔

یہاں میرے کچھ قدردان پیدا ہو گئے ہیں اور پچھلے دنوں انھوں نے میرے ذمہ یہ کام کیا تھا کہ یہاں کے بارے میں اپنی سہ ماہی رپورٹ پیش کروں۔ یہ فریضہ میرے سپرد اس لیے ہوا تھا کہ ان کے خیال کے مطابق مجھ جیسا حقیقت نگار یہاں کوئی نہیں۔ میں نے بھی اپنی عادت کے مطابق سب کچھ لکھ دیا ہے۔ بڑی ہپ ٹلاؤ رپورٹ ہے۔ اس میں اپنے ایک دوست کی خوب ڈٹ کر مخالفت بھی کی ہے۔ اور اس کا جو معاشقہ اندر ہی اندر چل رہا تھا، اس کا بھی کچا چٹھا لکھ دیا ہے۔

حتیٰ کہ میں نے رپورٹ میں یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہاں جو داڑھی نہ منڈوانے کا دستور ہے، وہ بعض نستعلیق قسم کی طبیعتوں پر گراں گزرتا ہے اس لیے اس کی اجازت

ہونی چاہیے کہ جس کا دل چاہے داڑھی رکھے جس کا دل چاہے نہ رکھے۔

اتنے بڑے حاکم کے سامنے اتنا کہہ دینا اور کسی قسم کی جھجک محسوس نہ کرنا، خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ تمہارے ہاں ایسی کوئی کھری بات ذرا سے وزیر اعظم کے سامنے کہہ دیتا تو میری زبان گدّی سے نکلوا دی جاتی۔

اِطلاعاً عرض ہے۔ یہاں میری کتاب "گنجے فرشتے" کافی پسند کی گئی ہے۔

ہو سکے تو میری بیوی بچّوں کا خیال رکھنا۔

خاکسار

سعادت حسن منٹو

۲۰ اپریل ۱۹۵۵ء

ندیم صاحب

احمد ندیم قاسمی کے متعلق لکھنا کچھ آسان نہیں ہے۔ جب ان کے نام کے ساتھ بھائی کی پخ لگا کر بات کروں گا تو میرے لیے زبان کھولنا اور مشکل ہو جائے گا۔ مجھے ڈر یہ ہے کہ اگر میں جذبات کی رَو میں بہہ گیا، تو مجھ سے آئینے پر سیاہی ملنے کا جُرم سرزد ہو جائے گا اس لیے قسم کھائے لیتا ہوں کہ ایسا نہ ہونے دوں گا۔ اگر میری احتیاط کے باوجود ایسا ہو گیا تو میری اس بیماری کو لاعلاج سمجھ کر معاف فرما دیا جائے۔

جیسے روپیہ کی افراط سے اچھے بھلے آدمیوں کا دماغ خراب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح واقعات کے ہجوم سے قلم کا ہاضمہ جواب دے دیتا ہے۔ جس کی شہادت یہ مضمون بھی دے گا۔ میں آپ کے سامنے اس ندیم کو لاؤں گا جو سب کا ندیم ہے۔ میں اپنے ندیم کا آپ سے تعارف نہ کراؤں گا۔ لیجئے یہیں سے مضمون پٹڑی سے اُتر گیا۔ اِس لیے کہ ان کی شخصیت میں دونوں صورتوں میں کوئی فرق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا ہر ملنے والا اسی غلط فہمی

میں سنتا ہے کہ "ندیم صاحب جتنے میرے دوست ہیں کسی اور کے نہیں" مصیبت تو یہی ہے کہ یہ اپنوں کے لیے بھی ویسے ہی ہیں جیسے دوسروں کے لیے آپ چاہیں تو ان کی بے خبری میں ان کا امتحان لے لیں، یہ آپ کو مایوس نہ کریں گے۔ آپ ان کے جتنے قریب آتے جائیں گے، اتنی ہی آپ کے دل میں ان کی عظمت بڑھے گی ایسے لوگ نمائش میں رکھنے کے قابل ہیں جو قربت میں اور زیادہ محبوب و محترم بننے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔

یہ بڑی خطرناک حد تک شریف ہیں، ان کی شرافت سے ہمیشہ انھیں نقصان اور دوسروں کو فائدہ پہنچا ہے۔ لیکن یہ اسے اپنا فائدہ اور دوسروں کا زیاں سمجھتے ہیں۔

میں نے بعض دوستوں کو ندیم صاحب کے فن سے اختلاف کرتے سنا ہے کہ یہ سیاست میں الجھ کر ذہنی طور پر بھٹک گئے ہیں لیکن یہ کسی سے نہیں سُنا کہ ان کی شخصیت میں فلاں کمزوری ہے۔

۱۹۴۰ء میں اپنے ایک دوست کے ذریعہ ان سے متعارف ہوا تھا۔

برسوں کی بات ہے "ادب لطیف" کے کسی سالنامے میں ان کا افسانہ "طلوع و غروب" چھپا تھا۔ پڑھا تو بڑا متاثر ہوا، متاثر کیا ہوا، فنا ہوگیا۔ بعضوں کے نزدیک یہ افسانہ فنا ہونے والا نہ ہوگا۔ میں چونکہ اپنی بات کر رہا ہوں۔ اس لیے اپنے ہی تاثرات کا ذکر کروں گا۔ یہ بات پُرانی ہے ممکن ہے وہ افسانہ میں آج پڑھتا تو فنا ہوتے ہوتے بچ جاتا لیکن یہ حادثہ تو پھر بھی گزر جاتا کہ متاثر ہونا ہی پڑتا۔ یہی وہ جذبہ تھا کہ ہم ایک سائیکل پر دو سوار ٹیکاٹیک دوپہری میں اچھرہ کی طرف چل دیئے۔

ان کے مکان پر پہنچے، آواز دی، تو ایک خوبرو اور خوش پوشاک گھبرو سے ملاقات ہوئی۔ یہ ان کا ملازم میاں تھا۔ نہ جانے اُسے دیکھ کر کیوں مجھے ندیم صاحب کے افسانوں کا ہیرو یاد آیا۔

اس نے رہنمائی کی تو ہم ندیم صاحب کے سامنے تھے۔ یہ اتنے سنجیدہ کہ مجھے ان کی سنجیدگی پر ہنسی آرہی تھی۔ جب ان سے میرا تعارف کرایا گیا تو انھوں نے مسکرا کر ہاتھ بڑھایا۔ تب میری جان میں جان آئی کہ انھیں تو مسکرانا بھی آتا ہے۔

اس کے بعد ندیم صاحب نے میرا نام پوچھا۔ اس لیے کہ پہلے میرا ان سے تعارف میرے دوست کی زبان میں ہوا تھا۔

میں نے دانستہ اپنا نام غلط بتایا ـــ "مجھے احمد شاہ کہتے ہیں۔"

ندیم صاحب نے ایک دم خوش ہو کر کہا: "میرا بھی اصلی نام احمد شاہ ہے۔ قلمی نام احمد ندیم ہے" ـــ اور ساتھ ہی یہ بھی پوچھا ـــ "آپ کرتے کیا ہیں؟"

"آپ کے افسانے پڑھتا ہوں۔"

"کچھ تو کرتے ہی ہوں گے ـــ پڑھتے ہیں؟ یا کوئی کام وام کرتے ہیں؟"

"نہ پڑھتا ہوں اور نہ ہی کوئی کام کرتا ہوں۔"

ندیم صاحب ایک دم اپنی افسانہ نگاری چھوڑ مشفق بن گئے، اور کہا۔ "یا تو پڑھیے یا کوئی کام کیجیے۔ اس لیے کہ بیکار انسان کو نہ قدرت معاف کرتی ہے اور نہ ہی عزیز و اقارب۔ دوست بھی چڑھتے سورج کی پرستش کرتے ہیں ـــ چونکہ آپ میرے ہم نام ہیں۔ اس لیے بھی مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔"

یہ پہلے دن کی بات آج میرا اور ان کا مقدر بن گئی ہے۔

ان کی زندگی میں بڑی یکسانیت ہے۔ یہ جیسے شریف آج سے چودہ برس پہلے تھے، ویسے ہی آج بھی ہیں۔ جیسا خلوص بھرا دل پہلے تھا۔ ویسا ہی آج ہے۔ جیسے یہ یاروں کے یار پہلے تھے، ویسے ہی آج ہیں۔ اب ان پر کوئی مضمون لکھے تو کیا لکھے۔ بڑی مشکل میں جان ہے۔

ان کے چہرے پر ایک بڑا سا گھاؤ ہے۔ جو قطب شمالی سے قطب جنوبی تک پھیلا ہوا ہے۔ اس کے بارے میں ان سے معلوم ہوا کہ بچپن میں ایک دن بھائی محمد بخش چاقو سے گنّے چھیل چھیل کر مزے سے چوس رہے تھے۔ میں نے حصہ مانگا۔ انکار پر چھینا جھپٹی شروع ہوئی تو چاقو کی تیز دھار رخسار پر تیرتی چلی گئی۔

یہ گھاؤ سب کا دیکھا ہوا ہے۔

ایک گھاؤ ان کے دل پر ہے جو اتنا ہی واضح اور اتنا ہی روشن ہے۔

ایک گھاؤ بچپنے کی یاد میں ہے اور ایک شعور کی یاد میں جو گھاؤ انھوں نے شعور کی یاد میں لگایا۔ اس کی تفصیل مت پوچھئے۔ ورنہ آپ کو خواہ مخواہ ندیم صاحب سے محبت اور حکومت سے محبت سے مختلف قسم کی کوئی چیز پیدا ہو جائے گی۔ اس لیے کہ یہ کسی زمانے میں کٹر قسم کے مسلم لیگی تھے۔ انھوں نے قیام پاکستان سے پہلے اُس وقت مسلم لیگ کی بے لوث خدمت کی۔ جب لیگ کا نام لینا خطرے سے خالی نہ تھا۔ پھر جب پاکستان حقیقت کا روپ دھار چکا اور دیکھتے ہی دیکھتے حاکمانِ وقت نے جان بوجھ کر نشتر اور گولیاں نگل لیں تو بعض ایسے مسائل پیدا ہو گئے۔ جو بڑے تکلیف دہ تھے۔ یہ بدقسمتی سے

باخوش قسمتی سے افسانہ نگار اور شاعر تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی تحریروں میں حکومت سے بڑے پیار میں کہا —— "بھئی ایسا نہ کرو۔ اپنی آنکھیں کھولو"

نتیجتہً حکومت ناراض ہوئی "نقوش" بند کر دیا گیا۔ اس لیے کہ اس وقت یہی ان کا سہارا تھا —— ذہنی اور جسمانی سہارا۔

پھر ریڈیو کے دروازے ان پر بند کر دیے گئے۔ اس لیے کہ عوام کے دلوں کے ساتھ ان کا بھی دل دھڑکتا تھا اور یہ علامت ہماری حکومت کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم ہے۔

پھر جیل کے دروازے ان پر وا کر دیے گئے۔ اس لیے کہ یہ پاکستان کے نامور ادیب تھے۔

حتیٰ کہ حکومت نے اپنی سمجھ کے مطابق ان پر جینے کے تمام دروازے بند کر دیے لیکن یہ پھر بھی جیتے رہے اور مسکرا مسکرا کر دوسروں کو بھی جینے کا انداز سکھاتے رہے۔

اللہ کا شکر ہے کہ وہ دن بیت گئے۔ یہ نہ پوچھیے کہ انھوں نے وہ دن کیسے کاٹے لیکن اتنی بات کہنے کو جی چاہتا ہے کہ انتہائی مالی اور ذہنی پریشانیوں کے ہجوم میں بھی انھوں نے کوئی ایسی کمزوری نہیں دکھائی جس سے ان کی خودداری، وقار اور عزتِ نفس پر آنچ آئی ہو۔

اس عرصے میں انھوں نے زیادہ سے زیادہ تخلیقی کام کیا تاکہ دو وقت کی روٹی کا بندوبست ہو سکے۔ ہندو پاک میں تخلیقی قوتوں کے سہارے عزت کی زندگی گزارنا تو ناممکن ہے لیکن اتنا مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی جبکہ ہمیں علم ہے کہ ایک بڑا لکھنے والا سسک سسک کر اپنی زندگی گزار سکتا ہے۔

عقائد کا معاملہ سراسر ذاتی ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہم اسے قومی اور ملی مسئلہ بنا لیتے ہیں جس سے بہت سے مسئلے اُلجھ جاتے ہیں۔ جو ذرا سا جرأت کے ساتھ سوچنے لگتا ہے۔ ہم اسے کمیونسٹ کہہ کر اُس سے زیادتی کرنے پر اُتر آتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ کچھ انہی نظریات پر راضی ہوتا جاتا ہے۔

ندیم صاحب کے متعلق میرا یہ خیال ہے کہ وہ بڑے پکّے مسلمان تھے نمازیں پڑھتے اور روزے رکھتے تھے۔ ترقی پسندی کو کمیونزم کا جزو نہیں سمجھتے تھے بعض اوقات کمیونسٹوں کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ جب ترقی پسند اپنی تحریروں میں سُرخ سویرا یا سُرخی کا لفظ لاتے تو یہ ڈرامہ بنایا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ بعض ادیب سُرخی کے علاوہ بات ہی نہیں کر سکتے۔ خواہ مخواہ شعرا ایسی لطیف صنف میں سُرخی اور سُرخ سویرا لا کر غیر شاعرانہ جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔

یہی خیالات ندیم صاحب کا ایمان تھے کہ حکومت نے ان کے بارے میں کچھ ایسا رویّہ اختیار کر لیا کہ یہ پہلے والے ندیم نہ رہے۔ ان کے نظریات میں شدت آ گئی اور انھوں نے علی الاعلان حکومت پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ پہلے جو جھجک سی تھی وہ بیباکی کی صورت اختیار کر گئی۔ اس طرح ان کی راست گوئی "گنہگاری" میں شامل ہوتی گئی۔

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی ‏ ‏ ‏ کچھ قید و رسم نے جسے ایمان بنا دیا

بھلا سوچئے تو جس نے ایسے ایسے پیارے شعر کہے ہوں کہ :

میں تجھ کو بھول چکا لیکن ایک عمر کے بعد ‏ ‏ ‏ ترا خیال کیا تھا کہ چوٹ اُبھر آئی

کوشش کے باوجود ابھی تک نہ چھپ سکے ‏ ‏ ‏ زلفوں کے پیچ و خم میں زمانے کے پیچ و خم

راہیں لُٹ سی گئیں، مٹ سے گئے قدموں کے نقوش
سُن رہا ہوں تری پازیب کی جھنکار ابھی

وہ "چلی مشین چلی" تک آیا۔ مقصدی شاعری بُری چیز نہیں ہے لیکن شعراورحساب کے فارمولے میں فرق ضرور باقی رہنا چاہیے۔

ندیم صاحب کو اپنے فن اور اپنی ذات پر بڑا اعتماد ہے۔ یہ دشواریوں اور مصیبتوں کے عالم میں بھی ہار نہیں مانتے۔ اگر ان میں اعتماد والی خوبی نہ ہوتی تو یہ کب کے انتقال فرما چکے ہوتے۔ اس لیے کہ ان پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹے ہیں۔ انھوں نے اپنے اعتماد ہی کے سہارے اِن دُکھ کے پہاڑوں کی بنیادوں کو لرزا دیا ہے۔ انھیں عمیق تیرگی میں بھی روشنی کے مینار اُبھرتے نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ماضی کی ناکامیوں کی طرف سے بے خبر ہو کر مستقبل کی تابناکی پر ان کا ایمان ہے۔

اگر یہ چارپائی پر بیٹھے ہوں۔ تکئے سے ٹیک بھی لگا رکھی ہو اور یہ ایک دم اکڑوں بیٹھ جائیں تو سمجھ لیجئے کہ یہ افسانہ لکھنے والے ہیں۔ اس وقت یہ سگرٹ پہ سگرٹ پئیں گے۔ خوبصورت سا کاغذ لیں گے۔ پنسل کو باریک بنائیں گے اور مہین مہین خط میں افسانہ شروع کر دیں گے۔ آپ لاکھ شور مچائیں یہ لکھتے رہیں گے۔ البتہ شعر کہنے کے لیے تنہائی چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ انھیں ہلکا ہلکا گنگنانا ہوتا ہے۔ چونکہ یہ اپنے ترنم کا مرتبہ جانتے ہیں۔ اس لیے اس خداداد دین کا حال سب پر آشکار کرنا نہیں چاہتے۔

یہ افسانہ نگاری سے زیادہ اپنی شاعری کو اہمیت دیتے ہیں۔ بعض یہ کہتے ہیں کہ یہ افسانہ نگار زیادہ بڑے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ شاعری میں ان کا پلڑا بھاری ہے۔ اصل میں یہ

دونوں میں اتنے کامیاب ہیں کہ بعضوں کے نزدیک یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے۔

ایک دن انھوں نے اس ضمن میں ایک لطیفہ سنایا کہ فلاں افسانہ نگار مجھے افسانہ نگار نہیں سمجھتا اور فلاں شاعر مجھے شاعر تسلیم نہیں کرتا۔ اگر خدانخواستہ یہ دونوں کسی ایک پرچے کے ایڈیٹر ہو جائیں تو میرا اس میں نہ کوئی افسانہ چھپے اور نہ کوئی شعر۔"

اب کوئی انھیں افسانہ نگار مانے یا نہ مانے شاعر مانے یا نہ مانے۔ یہ بات تو اپنی جگہ پر رہی ویسے یہ اب تک علم کے میدان میں اپنے کو طالب علم ہی سمجھتے ہیں۔

آج سے چھ سات برس پہلے کی بات ہے کہ پے بہ پے ان پر اختلاج قلب کے دورے پڑتے تھے۔ یہ سلسلہ کوئی دو تین برس چلتا رہا۔ یہ اچھے بھلے بیٹھے ہیں، بعض گفتہ بہ اور بعض ناگفتہ بہ مسائل پر گفتگو کر رہے ہیں کہ ایک دم ہاتھ پاؤں میں پسینہ آنے لگتا اور دل ڈوب جاتا۔ جب انھیں ہوش آتا تو کہتے "زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بس گیا۔

ایک دن میں ان کے ہاں گیا، تو یہ بڑے موڈ میں تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے پوچھا "آپ نے میرا افسانہ "جوانی کا جنازہ" پڑھا ہے۔ جب میں نے نفی میں جواب دیا۔ تو کہا "میں آپ کو سناتا ہوں۔" چنانچہ طلوع و غروب اٹھا لائے۔ یہ از خود بہت کم خوش نصیبوں کو سناتے ہیں۔ بہت ہوا تو کسی کو دو ایک شعر سنا دیے ـــ اب افسانہ پڑھا جا رہا تھا۔ مجھے ان کے پڑھنے کا انداز بڑا پسند ہے کیونکہ اس میں دھیمے پن کے علاوہ ایک خاص قسم کی انفرادیت اور معصومیت ہے۔ اس لیے میں ان کے پڑھنے کے انداز میں کھویا ہوا تھا۔ افسانے کا پلاٹ اور تحریر کے تیور بھی مجھے اپنی اپنی طرف ـــ

اشارے کر رہے تھے۔ ابھی انھوں نے چھ سات صفحے ہی پڑھے ہوں گے کہ انھوں نے دل دہلا دینے والی بات کہہ دی۔

"بھئی چلا میں، کتاب پڑھنا ـــ اس وقت بدقسمتی سے ان کے ہاں کوئی اور نہ تھا۔ اس لیے سخت پریشان ہوا۔ انھیں آہستہ سے چارپائی پر لٹا دیا۔ میں کبھی کرسی پر بیٹھ جاتا اور کبھی کھڑا ہو جاتا تھا۔ کبھی دروازے کی طرف دیکھتا تھا کہ کوئی تو آ جائے تاکہ ان کے لیے کچھ کیا جائے۔ میری سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ البتہ کبھی کبھی ان پر جھک کر اطمینان کر لیتا تھا کہ سانس بھی چل رہی ہے یا نہیں۔

یہ اُس وقت درد کی شدت سے نیم بے ہوش تھے۔ میری ہمت ملاحظہ ہو کہ ایک بار پریشان ہو کر جو اُٹھا تو چلنا شروع کر دیا۔ انھیں دیکھتا رہا اور اِدھر سے اُدھر، اُدھر سے اِدھر چلتا رہا۔ معاً صراحی کے پاس آ کر رُکا، صراحی سے پانی لیا۔ ان کے منہ میں ٹپکایا۔ پھر خیال آیا کہ ان کے ہاں شربت کی بوتل بھی ہے اور عرق بیدمشک بھی چنانچہ دونوں بوتلیں نکال کر بیٹھ گیا۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ عرق پلاؤں یا شربت۔ طے پایا کہ دونوں چنانچہ عرق اور شربت دونوں گلاس میں ڈالے۔ اب پلاؤں تو کس طرح پلاؤں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ دونوں کمروں میں گھبرایا ہوا پھر رہا ہوں۔ اس لیے کہ چمچہ نہیں مل رہا تھا۔ جب چمچہ نہ ملنے سے مایوس ہو گیا تو گلاس ہی سے شربت پلانا چاہا۔ نتیجہ یہ کہ دو ایک گھونٹ ان کے حلق میں اُترے۔ باقی کچھ ان پر اور کچھ چارپائی پر۔ جب ایسی ایسی عقلمندیاں مجھ سے سرزد ہو رہی تھیں تو سوچ رہا تھا کہ ان کے دوست اگر اس وقت نہیں آتے تو آج کے بعد انھیں یہاں آنے کا کیا حق ہے۔ قریب قریب

آدھ گھنٹے کے بعد انھیں ہوش آیا تو میری بھی جان میں جان آئی اور خدا کا شکر ادا کیا۔
تھوڑی دیر کے بعد اُٹھے تو کہا "بھئی معاف کرنا۔"

جب انھوں نے منہ پر اور بستر پر چپچپاہٹ دیکھی تو میں نے بھی کہا "بھئی معاف کرنا۔"

پشاور سے مجھے ندیم صاحب نے لکھا کہ دونوں مل کر ایک رسالہ نکالیں۔ نام "نقوش" ہوگا۔ ادارت کے فرائض بہن ہاجرہ مسرور کے اور میرے ذمّے، نفع نقصان میں برابر کے شریک۔ حکم کی تعمیل ہوئی، رسالہ جاری ہوا۔ اس میں برابر نقصان ہی چلتا رہا۔ اس لیے کہ یہ ادبی اور ساتھ ہی معیاری پرچہ تھا۔ کوئی فلمی پرچہ ہوتا تو آنکھوں میں بھی طراوت رہتی اور جیب میں بھی۔ اس کے دو شمارے بڑے چُپ چپاتے آئے۔ خوب پسند کیے گئے۔ تیسرے شمارے پر حکومت نے اس کی اشاعت اُس دن سے چھ ماہ کے لیے روک دی۔ جب مجھے نوٹس ملا، تو میں ندیم صاحب کے پاس اس "مژدۂ جاں فزا" کی اطلاع کے لیے پہنچا۔ ظاہر ہے کہ فکر کی بات تھی۔ اس لیے ہم متفکر ہو گئے۔ پریشانی کی ایک بات یہ بھی تھی کہ ہمارا چوتھا شمارہ (آزادی نمبر) بالکل تیار تھا۔ اس نمبر پر ہم نے جی کھول کر روپیہ صرف کیا ہوا تھا۔ اس لیے اس کی سیل کی فکر دامن گیر ہوئی۔ چنانچہ وہ رات ہم نے آنکھوں میں کاٹی۔ دو ایک دوستوں کے تعاون سے نقوش کی پیکنگ رات بھر ہوتی رہی۔ مزے کی بات یہ کہ میں نے بھی پیکٹ باندھے اور ندیم صاحب نے بھی۔ میں تو ماشاءاللہ اس فن میں اناڑی نہ تھا۔ اس لیے بڑے بڑے شاندار پیکٹ باندھے۔ البتہ ندیم صاحب نئے نئے پھنسے تھے؛ اس لیے بیچارے سخت پریشان تھے۔ ہم لاکھ انھیں منع کرتے کہ حضور جانے دیجیے۔ حضور رہتے کہ باز نہ آتے تھے۔ اُس وقت یہ پیکٹوں کے باندھنے کے سلسلے میں پابند شاعری کے بجائے آزاد شاعری

فرماتے رہے تھے۔ ہم نے بھی سوچا، چلو ٹھیک ہے۔ خلوص اور مروت کے مارے یہ ہمارا ساتھ دیتے رہے اور ہمیں شرمندہ کرتے رہے۔ آخر رات کے ایک بجے کے قریب اُردو کا یہ افسانہ نگار اور شاعر تھک ہار کر زمین پر سو گیا۔ جب یہ سارا منظر آج بھی میری آنکھوں کے سامنے آتا ہے تو اُس دن کی طرح آج بھی میرے منہ سے اپنی حکومت کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ اس طرح نقوش کا چوتھا شمارہ نکل آیا اور حکومت کو اعتراض کا موقع نہ ملا۔

ہند و پاک کے کونے کونے سے اس پر احتجاج ہُوا۔ اس لیے کہ نقوش کے ساتھ سویرا اور ادبِ لطیف پر بھی یہی نوازش کی گئی تھی۔ احتجاج کا نتیجہ یہ ہُوا کہ ابھی پانچ مہینے ہی گزرے تھے کہ حکومت نے پابندی اٹھا لی۔ لیکن ہم نے اس خسروانہ التفات کو قبول نہ کیا۔ چھ مہینے کی پابندی کے بعد جو پرچہ نکلا، اس میں ندیم صاحب کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ تلخی کی بات بھی تھی۔ اس لیے کہ ہمارا کوئی گناہ نہ تھا۔ وہ تو صرف ایک بہانہ ڈھونڈھ کر ہم پر گناہ کا الزام لگایا گیا تھا۔

میں اپنے جسم کے اعتبار سے بھی کمزور ہوں اور دل کے اعتبار سے بھی شاید یہی وجہ ہے کہ اعتدال پسند ہوں۔ چنانچہ میں نے دھیمے لہجے میں ندیم صاحب سے کچھ کہا۔ انھوں نے میری باتیں غور سے سُن کر اَن سُنی کر دیں۔ نقوش کے پانچویں نمبر سے لے کر دسویں نمبر تک میں ان سے دبے دبے انداز میں کہتا رہا کہ نقوش کی یہ روش اپنی حدود سے تجاوز کر رہی ہے۔ بعض باتیں ندیم صاحب کی معقول تھیں اور بعض میری۔ چنانچہ فیصلہ ہُوا کہ نقوش بند ہی کر دیا جائے۔

جب نقوش کئی مہینے بند رہا تو یار دوستوں نے مجھے ورغلایا کہ نقوش کو بند نہیں

ہونا چاہیے ندیم صاحب سے مشورہ کیجئے۔ وہ آپ کے دوست ہیں۔ آپ کی بات مان لیں گے۔ ایک دن باتوں باتوں میں میں نے ان سے یہ بات کہہ ڈالی یقیں جانئے۔ مجھے یہ بات کہتے ہوئے بڑا دکھ ہوا کہ آپ مجھے پرچہ نکالنے کی اجازت دے دیں۔ لیکن آپ اس کے ایڈیٹر نہ ہوں گے۔

ندیم صاحب کے ظرف کا اندازہ لگائیے کہ انھوں نے مجھے ایسا کرنے کی اجازت دے دی۔ انھوں نے یہ نہ سوچا کہ میں نے اس پر دن رات محنت کی ہے۔ یہ بھی نہ سوچا کہ جگ ہنسائی ہوگی یہ بھی نہ سوچا کہ میرے ان خوابوں کی تعبیر کیا ہوگی جو صرف نقوش سے وابستہ تھے۔ کہا تو صرف اتنا کہا۔ "خدا تمھیں اپنے ارادے میں کامیاب کرے"

میرے خلاف اس سلسلے میں کئی لوگوں نے ان کے کان بھرے۔ لیکن انھوں نے ہمیشہ یہ جواب دیا "میں آپ سے زیادہ طفیل کو جانتا ہوں"

ہاجرہ بہن نے بھی اس سلسلے میں بہت کچھ کہا۔ انھیں کہنے کا حق بھی تھا۔ اس لیے کہ انھوں نے ندیم صاحب کے ساتھ مل کر اس پر خونِ جگر چھڑکا تھا۔ لیکن جواب میں ہاجرہ بہن کو بھی وہی سب والا جواب ملا۔ البتہ بعد میں انھوں نے اپنے اکا دکا مضامین میں اس دکھ کا اظہار قدرے تلخی سے کیا ہے۔

میرا اس معاملے میں زیادہ زبان کھولنا مناسب نہیں۔ اگر اس وقت میرے ہاتھ میں قلم ہے تو مجھے اس سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہیئے۔ ممکن ہے یہاں بعض باتوں کے صاف نہ ہونے سے میرے بارے میں کسی غلط فہمی یا زیادتی کا احساس بڑھے۔ لیکن جب یہ معاملہ ہمارا آپس کا معاملہ ہے تو دوسروں کے لیے غلط فہمی بڑھتی ہے تو بڑھے۔

ندیم صاحب اور ہاجرہ بہن کے گھرانے کا یا گھرانوں کا ایک دوسرے کے اتنا
قریب آنا عجیب نظروں سے دیکھا گیا۔ ہر شخص نے اپنی اپنی قابلیت کے مطابق اس
پر حاشیہ آرائی کی۔ اس ماحول نے ہماری ذہنیتوں کو اتنا پراگندہ بنا دیا ہے کہ ہم کسی ایسی بات
کا تصور تک نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر بازار میں سگے بہن بھائی بھی جا رہے ہوں تو
لوگ یہی سوچتے ہیں کہ یہ کوئی گڑبڑ والی بات ہے۔

ندیم صاحب کی زندگی میں یہ واقعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے اس سے
گریز میرے لیے بڑا مشکل ہے۔ بھلا ہو ہاجرہ بہن کا کہ انھوں نے اس بارے میں خود
ہی لکھ کر میری مشکل آسان کر دی۔ ورنہ مجھے یقین تھا کہ میں اس سلسلے میں بہت سی باتیں
کہتا۔ لیکن بات پھر بھی نہ بنتی:

"اللہ میاں کے دربار سے کچی کچی کلیوں جیسی دو روحیں ایک فرشتے
کو دی گئیں کہ ان دونوں کو ایک ہی ماں کی ممتا کے سائے میں کھیلنے
کے لیے زمین پر بھیج آئے۔ ہندوستان کے لیے دن رات روحیں
ڈھوتے ڈھوتے فرشتے کے ہاتھ پاؤں تھکن سے سُن ہو رہے تھے۔
ایک روح وہیں عرش پر ہاتھ سے پھسل گئی اور فرشتے کو پتہ نہ چلا
"یوں ایک اکیلی روح زمین کی طرف روانہ کر دی گئی۔ اس روح
نے احمد شاہ کی صورت مغربی پنجاب کے ایک کوہساری گاؤں میں جگہ پائی
جھولے اور لوریاں سننے کی ابتدا کی۔ مگر یہ کچھ عجیب کھوئی کھوئی سی
رہتی تھی جیسے کچھ رکھ کر بھول گئی ہو۔ سب کی سمجھ اور سب کی

شاید زندگی کے بارہ برس تعمیر کرنے کے کام آ گئیں۔ مگر احمد شاہ کی روح کھوئی کھوئی سی بنی رہی۔

اچانک فرشتے کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور عرش کی وسعتیں چھان ماریں تو وہ وہیں کسی گوشے میں ایک روح پڑی خاک دھول میں اٹ رہی تھی۔ وہ خدا کے خوف سے کانپ گیا۔ رُوح کو اُٹھا کر جھاڑا پونچھا۔ اب اللہ میاں کے حکم کی تعمیل کیسے ہو۔ اور پھر یہ بھی ڈر کہ کہیں یہ دونوں روحیں اکٹھی ہو گئیں تو اللہ میاں تک میری لغزش کی شکایت نہ پہنچا دیں۔ اس نے پنجاب کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور روح کو یہ سوچ کر لکھنؤ کی طرف روانہ کر دیا کہ یو۔ پی اور پنجاب کی نفرت اب انھیں کیا ملنے دے گی۔

اور جب زمین پر آ کر اس نے انگوٹھا چوسنا شروع کیا تو دادا بولے "میں نے خواب دیکھا ہے۔ اس کا نام احمد ہی رکھو۔" ماں جل گئیں۔ بڑے میاں کو تو ایسے ہی خواب نظر آتے ہیں۔ واہ اس کا نام تو ہاجرہ ہوگا" باپ نے سوچا" نہیں اس کا نام مسرور ہونا چاہیے ... ننھی سی جان تینوں ناموں میں گھستی پھری۔ مگر وہ مسرور تو ہرگز نہیں تھی۔ عجیب کھوئی کھوئی سی روح تھی۔ جیسے کچھ رکھ کر بھول گئی ہو۔

اور جب اپنے ابا کا احمد شاہ، احمد ندیم بن گیا تو اپنے دادا کی

احمد بی بی، ہاجرہ مسرور، تو انھوں نے بڑے فاصلے سے ایک دوسرے
کو دیکھا اور چونک پڑے۔ دونوں کی راہیں دو الگ الگ
خاندانوں کی بات ڈٹی کھڑی تھی۔ صوبائی تعصب ناگ بھوں سیکڑے
دراز تھا اور جانے کیا الم غلم۔ مگر پھر بھی ندیم بڑھا، ہاجرہ اٹھی اور
دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔

"بجی بہن"

"منو بھیا"

اور دونوں مارے خوشی کے رو پڑے۔

اور وہ دونوں آج تک سوچتے ہیں کہ ہمیں اتنی مدت تک
کس قوت نے جدا رکھا، اور عرش کے ایک دریچے سے ایک فرشتہ
اب بھی کبھی کبھی جھانک کر دیکھ لیتا ہے کہ اس غلطی کی اطلاع اوپر
تو نہیں آ رہی ہے"

اس ضمن میں اگر میں آپ سے کچھ کہتا تو وہ سیدھی سی باتیں ہوتیں۔ ہاجرہ بہن چشم بد دور ادیبہ ہیں۔ اس لیے انھوں نے ادیبانہ رنگ میں سب کچھ کہہ ڈالا بہر حال عرض تو مجھے بھی یہی کچھ کرنا تھا۔

جب میں ۱۹۴۵ء میں لکھنؤ گیا تھا تو چلتے ہوئے ندیم صاحب نے مجھے ایک رقعہ دیا اور کہا تھا وہاں ہاجرہ اور خدیجہ بہن سے ملنا۔ لکھنؤ سے جب واپس آیا تو ندیم صاحب انکہ میں بیٹھے۔ میں نے انھیں خط لکھا کہ بخیریت واپس آگیا ہوں اور وہاں ہاجرہ مسرور

اور خدیجہ مستور کے ہاں بھی گیا تھا۔ چند دنوں بعد ندیم صاحب کا جواب آیا۔ اُس میں لکھا تھا کہ ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے ناموں سے پہلے آپ ایک ضروری لفظ بھول گئے ہیں۔ اور وہ لفظ "بہن" ہے اُس وقت میں نے سوچا تھا کہ ان کا کون بھائی نہیں ہے، اور کون بہن نہیں ہے۔ جبکہ بہن سازی ان کی ہابی بھی ہو۔

قیامِ پاکستان سے پہلے مجھے اتنا ہی معلوم تھا کہ ندیم صاحب کی سگی بہن صرف ایک ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد معلوم ہُوا کہ میری سابقہ معلومات معتبر نہ تھیں۔ اس لیے کہ میری فہرست میں خدیجہ اور ہاجرہ بہن کا نام نہ تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ آج اس سلسلے میں میری معلومات بالکل اپٹوڈیٹ ہیں۔

میں نے بڑی کوشش کی کہ ہاجرہ بہن ندیم صاحب پر ایک مضمون لکھ دیں کیونکہ میرے خیال میں ان پر لکھنے کا سب سے زیادہ حق انہی کو پہنچتا ہے۔ اس لیے کہ وہ عورتوں کی زبان میں مردانہ باتیں کہنے کی ہمت رکھتی ہیں اور میں مردانہ زبان میں عورتوں کی سی باتیں کرنے کی بھی اہلیت نہیں رکھتا۔ بہرحال انھوں نے اپنی اس معذوری کے بارے میں جو مجھے خط لکھا وہی پیش کر دیتا ہوں۔

محترم بھائی طفیل صاحب، آداب

بھیّا کا اسکیچ لکھنے کی خود مجھے انتہائی آرزو ہے ——— لیکن میں ہوں کہ میری عقیدت، محبت اور لالہ (ندیم صاحب) کی عظمت کے اس صفحے سے کتنے لوگوں کو دلچسپی ہوگی۔ میں نے لالہ کی زندگی کے ہر رُخ کو اتنی گہری

نظر سے دیکھا ہے۔ کہ مشاہدات کا ایک انبار ہے۔ اگر میں سب سچ سچ لکھ دوں تو یہ کتنے صفحوں پہ پھیلے گا۔ اور پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اتنی سچائی کا ادب میں کیا درجہ ہوگا؟ لوگ تو اسے بہن کے پیار والی بات کہہ کر ٹال دیں گے ـــ اس لیے شاید میں ابھی لالہ کے بارے میں نہ لکھوں۔ پھر کبھی! ـــ آپ اُن پر لکھیں۔ آپ سے زیادہ انھیں کون جانتا اور سمجھتا ہے۔

ہاجرہ مسرور

ان کے خاندان میں پیری مریدی کا دھندا اب تک موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اکثر دیکھا کہ جب بھی کوئی صاحب ان کے گاؤں سے آئے۔ تو وہ آتے ہی ان کے پاؤں پڑ گئے۔ اب یہ اسے ہاتھ سے اُٹھاتے ہیں اور کہتے ہیں "بھئی اُٹھو! مجھے کیوں گنہگار بناتے ہو۔"

مُرید ہیں کہ کہتے چلے جا رہے ہیں ـــ "شاہ صاحب آپ کے قدموں کے نیچے جنت ہے ـــ آپ کے پاؤں کی خاک بھی ہمارے لیے نعمت ہے ـــ آپ کی کہی ہوئی بات پتھر کی لکیر ہے۔"

جب ندیم صاحب گرفتار ہوئے تو کچھ عرصے کے بعد ان کے گاؤں سے ایک آدمی آیا۔ اور اُس نے مجھ سے پوچھا "سُنا ہے شاہ صاحب گرفتار ہو گئے ہیں؟" میں نے اثبات میں جواب دیا۔ تو اُس نے حیرت سے پوچھا "اُن کی گرفتاری

پر یہاں کوئی گڑبڑ نہیں ہوئی ؟"

"گڑبڑ کیسی ؟"

میرے اس جواب سے وہ بڑا مایوس ہوا۔ تھوڑے سے وقفے کے بعد اُس نے "ہائے" کیا۔ پھر خاموش ہو گیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ صاحب پھر بولے "اگر ہمارے گاؤں سے شاہ صاحب کو کوئی گرفتار کرتا تو کم از کم پندرہ بیس آدمی تو اُن پر اپنی جان نچھاور کر دیتے۔ تب کوئی مائی کا لال انھیں گرفتار کر سکتا۔ لیکن آپ حضرات عورتوں کی طرح منہ تکتے رہے اور سپاہی ہمارے شاہ صاحب کو لے گئے۔ کیا شہریوں کے دلوں میں پیار اور محبت ہوتی ہی نہیں۔"

محبت کی کمی اور زیادتی کے سلسلے میں ایک بات اور سُن لیجیے جس دن ندیم صاحب گرفتار ہوئے۔ اُس دن ہمارے دفتر میں ان کی ایک تصویر لٹکی ہوئی تھی — میں نے سوچا کہ ندیم صاحب گرفتار ہو گئے ہیں اور ان کی شخصیت حکومت کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ اس لیے مجھے ان کی تصویر اُتار دینی چاہیے۔ آہستہ سے کرسی پر سے اُٹھا — تصویر کی طرف دیکھا اور اُتارنے کے لیے ہاتھ بڑھائے تو تصویر مجھے بولتی ہوئی محسوس ہوئی۔ "بس اتنی ہی محبّت تھی ؟"

میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور پھر کرسی پر بیٹھ کر اپنا کام کرنے کی کوشش کی۔ لیکن ندیم صاحب ہیں کہ بُری طرح یاد آ رہے ہیں۔ اس لیے کہ ندیم صاحب ہمارے ہاں ہر روز آیا کرتے تھے۔ گپّیں ہوا کرتی تھیں۔ ادبی مسائل پر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ چائے سامنے رکھ کر لطیفے سنتے اور سُناتے تھے — اُس دن یقین تھا کہ آج اُن سے ملاقات

نہ ہوگی ۔ بعض اوقات مجھے ایسا محسوس ہوتا کہ میں رو رہا ہوں۔ آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر تصدیق چاہی تو وہ خشک ۔

دل میں اک بوُند لہو کی نہیں رونا کیسا
اب ٹپکتا نہیں آنکھوں سے گلستاں کوئی

جو بھی دوست آتا۔ وہ نیم صاحب کی گرفتاری پر افسوس کرتا اور ساتھ ہی مشورہ دیتا کہ ان کی تصویر اُتار دو۔

چنانچہ شام کے قریب میں نے وہ تصویر اُتار دی۔ اس وقت تصویر نے مجھ سے کچھ نہ کہا۔ مجھی کو تصویر سے کہنا پڑا " معاف کر دینا میرے بھائی! "

یہ بچپنے کی ایک شرارت کا ذکر بڑے مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں کہتے ہیں کہ میں اور میرے بڑے بھائی کوئی چھٹی ساتویں میں پڑھتے ہوں گے کہ ان دنوں ہم نے جمال گوٹہ کا نام سنا۔ یہ بھی علم ہوا کہ یہ کوئی اچھی چیز نہیں۔ ایک دن ہم دونوں جب ایک حکیم کی دکان پر گئے۔ تو ہم نے وہاں ایک ڈبہ پر جمال گوٹہ لکھا ہوا دیکھا۔
ہم نے دو آنے کا جمال گوٹہ خرید لیا۔ گھر آکر سوچا کہ اب اس کا استعمال کیا ہو۔ بالآخر ذہن میں ایک بات آئی کہ چچا مرحوم کے جو دو تین ملازم ہیں۔ اُن پر بسم اللہ کی جائے اور دیکھا جائے کہ ہوتا کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے اُسے سالن میں ڈالا اور تینوں ملازموں کو کھلا دیا۔ ابھی آدھ گھنٹہ بھی نہیں گزرا تھا کہ ان میں سے ایک دوڑا لوٹا لے کر۔ ابھی پہلا فارغ نہیں ہوا کہ دوسرا بھی اُدھر، حتیٰ کہ تیسرا بھی ـــ کیفیت یہ تھی کہ تو چل میں آیا۔

بے چارے بُری طرح نڈھال ہو گئے۔ اُن میں سے ایک تو بے ہوش ہو گیا۔
اب ہم دونوں بڑے پریشان کہ کیا کریں کیا نہ کریں۔ چچا مرحوم کچہری میں تھے۔ انھیں
لپک کر اطلاع دی کہ گھر آئیے، نہ جانے سب کے سب ملازموں کو کیا ہو گیا ہے۔
چچا گھبرائے ہوئے آئے تو دیکھا کہ سب کے سب دراز ہیں۔ اُن سے چچا پوچھتے ہیں
"بھئی کیا قصہ ہُوا؟" تو ان سے بولا تک نہیں جاتا۔ سب ہاتھ کے اشاروں سے بتاتے
کہ آخری وقت آن پہنچا ہے۔

یہ بڑے جذباتی اور بڑی خود دار طبیعت کے مالک ہیں۔ چھوٹی سی بات پر
اتنا خوش ہو جائیں گے کہ آپ سوچنے لگیں گے کہ یہ بات تو اتنی خوشی کی نہ تھی اور
کبھی چھوٹی سی بات پر خفا ہو جاتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انھیں خفا ہونا آتا ہی
نہیں۔ خفگی کے موقع پر یہ بڑے اوپرے اوپرے معلوم ہوتے ہیں اور اس وقت ان کی
حالت بڑی عجیب ہوتی ہے۔ جیسے کہہ رہے ہوں کہ "بھئی اب میں خفا تو ہو گیا ہوں۔
لیکن اسے نبھاؤں کیسے!"

چودہ برس میں میں نے انھیں صرف دو بار ناراض ہوتے دیکھا ہے۔ ایک بار تو
یہ ستم انھوں نے مجھی پر ڈھایا تھا۔ نتیجہ یہ کہ جب میں بھی ناراض ہو گیا۔ تو انھوں نے فوراً سفید
جھنڈی دکھا دی اور صلح ہو گئی۔ قصور بھی میرا نہ تھا۔ بس یہ ذرا سے جذباتی ہو گئے تھے۔
انھوں نے مجھ سے اتنی جلدی صلح کر کے اتنی محبت کا ثبوت دیا کہ مجھے یہ تک پتہ نہیں
چلنے دیا کہ جب یہ کسی سے ناراض ہو جاتے ہیں تو خود اُن پر کیا بیتتی ہے۔

اور ایک بار ہمارے دفتر میں ایک بے چارے سی۔ آئی۔ ڈی کے افسر پر برسے۔

وہ صاحب ہر دوسرے تیسرے روز ان سے انجمن ترقی پسند مصنفین کی سرگرمیوں کی تفصیلات حاصل کرنے آیا کرتے تھے۔ یہ اپنی طبیعت کی سادگی کی وجہ سے کچھ بتا دیا کرتے تھے۔ جب انھوں نے یہ معمول بنا لیا۔ تو یہ ایک دن برہم ہو گئے۔

"حضرت! کیا آپ نے مجھے مخبر سمجھ رکھا ہے؟" "آخر آپ تنخواہ کس بات کی لیتے ہیں جو مجھ سے آ آ کر باتیں پوچھتے ہیں۔ خبردار جو کبھی ادھر کا رُخ کیا۔"

یہ بے چارا کوئی بڑا شریف آدمی تھا۔ اس لیے اُس نے پھر کبھی ادھر کا رُخ نہیں کیا۔

بعد میں کہنے لگے "میں نے اُسے خواہ مخواہ جھڑکا۔ کسی کے دل کو کسی صورت میں نہیں دُکھانا چاہیے۔ وہ بیچارا تو اپنی ڈیوٹی سے مجبور تھا۔"

ندیم صاحب کی شادی اس وقت ہوئی۔ جب مجھے یہ یقین ہو چلا تھا کہ اب ان کی شادی کیا ہو گی۔ ایکا ایکی انھوں نے میری غلط فہمی یہ کہہ کر دُور کر دی "پرسوں گاؤں جا رہا ہوں اس لیے کہ میری شادی ہے" مجھے اس اطلاع سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس لیے کہ ان کی شادی گاؤں میں ہو رہی تھی۔ دبے لفظوں میں مَیں نے کہہ بھی دیا۔ بہتر یہی تھا کہ "آپ کی شادی بجائے گاؤں کے شہر میں ہوتی۔"

کہنے لگے "میں ذہناً آپ کا ہمنوا ہوں۔ لیکن طبعاً بزرگوں کی کسی بات کو رد نہیں کر سکتا۔"

میرے خیال میں اس جذبہ کے ساتھ۔ ساتھ یہ جذبہ بھی کار فرما تھا کہ "میری بہترین رفیقۂ حیات اگر کوئی بن سکتی ہے تو وہ دیہاتی لڑکی ہے" اس لیے کہ انھوں نے اپنے فن

میں بھی اسی کے خواب دیکھے تھے۔ پھر ان میں جو ایک تعمیر کا جذبہ ہے۔ اس کے ہاتھوں بھی یہ مجبور رہتے۔ سوچتے ہوں گے کہ میں ایک دیہاتی خوبصورت سی لڑکی کو اپنے ڈھب پر لا کر اپنی خوشیوں کو لازوال بنا لوں گا۔

اور اس کا پس منظر کچھ اور بھی ہے۔

شاید اس کا علم کسی کو نہ ہو کہ انھوں نے ایک دیہاتی لڑکی سے محبت کی تھی۔ اور ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ یہ بات ہے جب کی کہ یہ لکھنے کے میدان میں اُبھرتے چاند کی طرح تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ لیکن اس وقت ان کا حلیہ عجیب و غریب تھا۔ لمبی لمبی قلمیں تھیں۔ کلاہ کے اُوپر کلف لگی پگڑی، بڑے گھیرے والی شلوار اور اچکن کے ساتھ تڑے گرانڈیل قسم کے چپل ــــ اور ان کے ہمراہ عشق! ــ ممکن ہے وہ دوشیزہ بھی ان کا یہی حلیہ دیکھ کر ان پر عاشق ہوئی ہو۔

اُس لڑکی کے متعلق جو کچھ میری معلومات ہیں وہ یہ کہ بڑی خوبصورت مگر یتیم، غربت اتنی کہ نوبت فاقوں تک آپ بھی ماشاءاللہ بیکار، مطلب یہ کہ صحیح معنوں میں عاشق۔

جب دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انھوں نے اپنے اس ارادے کا ذکر اپنی والدہ سے کیا تو اُنھوں نے انھیں سمجھایا بجھایا۔ لیکن دل کی چوٹ نے کہیں زبان کی حلاوتوں سے تسکین پائی ہے، جو انھیں تسکین ملتی۔ جب یہ کسی طرح نہ مانے تو شرط یہ ٹھہری کہ پہلے دو سو روپے کما کر لاؤ تب!

چنانچہ اُردو کا یہ بڑا ادیب اور شاعر پہاڑوں سے اُترا، میدانوں میں آیا، چھوٹی چھوٹی نوکریاں کر کے روپے لے کر اپنے گاؤں پہنچا تو اس لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔

اس واقعہ کا بڑا شدید اثر ان کی شخصیت پر ہوا۔ انھوں نے اپنی حالت بالکل پاگلوں ایسی بنالی۔

اُس لڑکی کو بھی ان سے مثالی پیار تھا۔ چونکہ ان دونوں کی محبت پاکیزگی اور طہارت کے جذبہ کے ماتحت پروان چڑھی تھی۔ اس لیے دنیا کی کوئی طاقت ان کے دلوں سے اُسے محو نہ کر سکی۔

شادی کے فوراً بعد وہ شدید بیمار ہوئی۔ دن بہ دن اُس کی حالت خراب ہوتی گئی۔ اسی حالت میں اُس نے انھیں بلا بھیجا، اور یہ دونوں آنسوؤں کی زبانی آپس میں بات چیت کرتے رہے — حتّٰی کہ اُس نے آخری سانس لینے سے پہلے بھی انھیں بلایا تاکہ انھیں ایک نظر دیکھ کر موت کی آغوش میں راضی خوشی جاسکے۔

یہ لڑکی ان کی زندگی پر اثر انداز ہوئی۔ ان کی تخلیقات پر اثر انداز ہوئی۔ کبھی یہ محبوبہ کے روپ میں سامنے آکر ان سے قطعات کہلواتی رہی اور کبھی یہ صبا کے روپ میں ان کے افسانوں کی ہیروئن بنی۔ دھڑکنیں (رم جھم) کے بیشتر قطعات اسی محبت کی رُوداد ہیں۔ یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ دھڑکنیں کے تمام قطعات انھوں نے چُھپ چُھپ کر کوئی ہفتہ بھر میں کہہ ڈالے تھے۔ یہ ایک لگن تھی جس نے ایسے بولتے ہوئے قطعات اتنے مختصر سے وقفہ میں ان سے کہلوا دیئے — اس طرح یہ میرے نزدیک ایک مکمل انسان بنتے ہیں۔

بیٹھے بیٹھے ایک دن میں نے انھیں اپنی سائیکلنگ کے بارے میں ایک قصّہ سنایا کہ فلاں بھرے بازار میں اس انداز سے گرا کہ بوڑھے، بچّے، جوان، حتّٰی کہ خود میں تک ہنس دیں اور میں بڑا اچھی ہوا۔

ندیم صاحب نے کہا کہ سائیکل خواہ کتنی بھی احتیاط سے چلائی جائے لیکن آدمی کبھی اپنی غلطی سے کبھی دوسرے کی غلطی سے گر ہی جاتا ہے۔ ایک قصہ میرا بھی سنو۔

"میں بڑا محتاط ہو کر سائیکل چلاتا ہوں۔ اس لیے کہ مجھے علم ہے کہ لاہور کے باسیوں میں کئی ایک مجھے جانتے اور پہچانتے ہیں۔ چنانچہ ایک دن میں سائیکل پر سوار مزے سے جا رہا تھا۔ سر پر سولا ہیٹ تھا۔ اس لیے کہ گرمیوں کی دوپہر تھی کہ عین نسبت روڈ کے چوک میں نہ جانے کیا ہوا کہ میری کسی سے زور کی ٹکر ہوئی۔ میں کئی قلابازیاں کھاتا ہوا گرا۔ سائیکل مجھ سے یوں دور جا پڑی۔ جیسے وہ کبھی میری نہ تھی۔ لوگ مجھے اٹھانے کے لیے لپکے۔ اٹھا تو پتلون جھاڑی۔ ایک صاحب نے سائیکل تھمائی۔ کافی لوگ جمع تھے۔ نہ جانے وہ کس کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ میں نے سوچا یہ وقت کھسک جانے کا ہے۔ پیڈل پر پاؤں رکھا، سوار ہوا اور چل دیا۔

اتنے میں آواز آئی۔ بابو جی اپنا ہیٹ تو لے جائیے۔"

میں نے سنا ہے کہ یہ سوتے میں کراہتے ہیں۔ نہ جانے یہ ڈراؤنے خواب دیکھتے ہیں یا ان پر یہ ماحول کا اثر ہے۔ جو غیر شعوری طور پر ان کی بے خبری میں خلوت کی انجمن آراستہ کرتا ہے اور جب اس خواب کا انجام سامنے آتا ہے تو یہ کراہتے ہیں۔ ورنہ یہ سوتے میں کراہنا بے سبب نہیں ہو سکتا۔

ہوتا ہے راز عشق و محبت انھیں سے فاش
آنکھیں زباں نہیں ہیں مگر بے زباں نہیں

نہ جانے یہ اس طرح کب تک کراہتے رہیں گے۔ خدا کرے کہ وہ دن جلد آئے

کراہنے کے بجائے ان کے مسرّت کے قہقہے سنیں۔ لیکن کیا یہ دَور ہماری اور آپ کی زندگی میں آجائے گا؟

بدقسمتی سے میں نے انھیں کبھی بیساختہ قہقہے لگاتے نہیں دیکھا۔ ویسے یہ اپنی طرف سے بڑے بڑے لطیفے بیان کرتے ہیں۔ اتنے لطیفے کہ ٹاک ختم نہیں ہوتا اور پھر اتنا پیارا انداز کہ آپ کو مزا آجائے۔ جیسے کوئی گھٹا ٹوپ اندھیرے میں پھلجڑی چھوڑ دے۔ اور اس طرح کہ پہلی پھلجڑی ختم نہ ہو کہ اُس سے دوسری پھلجڑی لگا دی جائے۔

یہ ہنستے ضرور ہیں لیکن ہنسی کی جو روح ہے، وہ مفقود ہے۔

انھیں اپنی والدہ سے عشق ہے۔ اگر سچ پوچھیں تو یہ اُنہی کے لیے جیتے ہیں گھر جائیں گے تو ہر وقت والدہ کے پاؤں دباتے رہیں گے۔ اس لیے کہ انھیں بڑی روحانی مسرّت حاصل ہوتی ہے اور اس خوشی میں وہ اپنا آدھا آدھا دن صرف کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی والدہ کی میٹھی میٹھی باتیں سنتے رہتے ہیں۔ یہ ان کے سامنے مچل مچل جاتے ہیں، جیسے دو برس کے بچے ہی تو ہوں۔ یہ آج بھی اپنی والدہ کی گود میں سر رکھ کر ان کا پیار حاصل کرتے ہیں۔ اور یہ ان کی سب سے بڑی خوشی ہے۔

انھیں بچوں سے بھی بڑا پیار ہے۔ ہر ایک کے بچے کو دیکھ کر خوش ہو جائیں گے اُس سے باتیں کریں گے۔ اُسے چھیڑیں گے، اُسے تنگ کریں گے۔ حتیٰ کہ خود بچہ بن جائیں گے ـــ ان کی دو بچیاں ہیں۔ اُن سے بھی ہر وقت دُلار کرتے رہتے ہیں۔ اللہ جانے یہ بچیوں کی والدہ سے کتنا پیار کرتے ہوں گے۔ جبکہ پیار، محبت اور خلوص ہی ان کی زندگی ہو۔

گھر کے نوکران سے بڑے خوش رہتے ہیں۔ اس لیے کہ کبھی بھول چوک ہو جائے تو

ڈانٹتے ڈپٹتے نہیں، بلکہ نرمی سے انھیں سمجھائیں گے اور ان کا دل کسی طرح آزردہ نہ ہونے دیں گے۔ چھوٹوں اور بڑوں کا احترام کرتے ہیں۔ ہر ایک کے مرتبہ کا بہ طورِ خاص خیال رکھتے ہیں۔

انھیں ترکاریوں اور دال سے بڑی نفرت ہے۔ صرف گوشت خوش ہو کر کھاتے ہیں، وہ بھی بھنا ہوا جس میں خوب گھی پڑا ہو۔ پراٹھوں اور خالص دیہاتی قسم کے حلوے کا بھی بڑا شوق ہے۔ اور یہ اپنی ہر بیماری کا علاج حلوے کو سمجھتے ہیں۔

سنا ہے کہ اگر یہ گھر میں منہ بنائے بیٹھے ہوں اور طبیعت خراب اور اداس ہو، تو ظاہر ہے گھر والے اس قسم کی باتیں پوچھیں گے: "کیا بات ہے؟" "کچھ طبیعت ناساز ہے؟" "کسی چیز کو دل چاہ رہا ہے؟" — تو یہ جواب میں بہت آہستگی کے ساتھ کہیں گے: "بدن ٹوٹ رہا ہے۔ اگر ذرا سا گرم گرم حلوہ بنا دیں تو شاید جسم کو آرام ملے" — ان کے گھر والوں کا خیال ہے کہ اگر ان کے پاؤں میں موچ آگئی ہو تو ان کے نزدیک اس کا علاج حلوہ ہی ہے۔

یہ بھی سنا گیا ہے کہ یہ چور ہیں۔ ویسے تو بعض ادیب چور رہتے ہیں۔ وہ ایسے کہ ہیرا پھیری سے باز نہیں رہ سکتے۔ کچھ قدما سے اڑا لیا۔ کچھ غیر زبانوں سے، تھوڑا سا اپنی گرہ سے خرچ کیا اور ایک چیز تیار کر ڈالی۔ ایسی چوریاں قابلِ معافی ہیں۔

لیکن یہ تو شکر چور ہیں — گھر میں شکر رکھی ہے لیکن چوری ہو رہی ہے۔ چونکہ راشن ہے، اس لیے احتیاطاً تالا ڈالا گیا۔ پھر بھی چوری بدستور! گھر والے حیران کہ آخر شکر جاتی کہاں ہے۔ کوئی ان پر شک تک نہیں کر سکتا۔ آخر جب چھپ چھپ کر اس چوری کا سراغ لگایا تو ایک بار یہ حضرت عین موقعے پر پکڑے گئے۔

ایک اور قصہ سنئے :-

ایک بار میں ان کے گھر گیا تو یہ میرے ساتھ اچھے بھلے پلنگ پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ایک دم پلنگ سے چھلانگ لگا کر دور جا بیٹھے۔ میں بڑا حیران ہوا کہ آخر انھیں ہوا کیا۔ ساتھ ہی ساتھ تھوڑا سا مسکرائے۔

میں نے سبب پوچھا۔ تو جواب میں پھر مسکرا دیئے۔ جب میں نے اصرار کیا تو کہنے لگے کہ میں اب جس جگہ آکر بیٹھا ہوں۔ وہاں ایک ایسی چیز پڑی ہوئی ہے جو میں آپ کے دفتر سے چرا کر لایا تھا۔ سوچا کہ اس پر آپ کی نظر نہ پڑ جائے اس لیے وہاں سے اُچک کر یہاں آیا ہوں۔ اور ساتھ ہی ایک ہاتھ سے اپنے نیچے سے ایک پیڈ نکال کر مجھے دکھایا اس پر میں خوب ہنسا اور میں نے ان سے کہہ دیا کہ آپ میری روز چیزیں چرایا کریں۔ بشرطیکہ اسی معصومیت کے ساتھ اخفائے راز کی بھی کوشش کریں۔

ایک دن ہم نے ایکا ایکی آؤٹنگ کا پروگرام بنا لیا تھوڑے سے پھل خریدے اور شالامار چلے گئے۔ پھل کھاتے رہے اور باتوں سے لطف اندوز ہوتے رہے کہ کسی نے کہہ دیا "بیت بازی" ہو جائے اور جو فریق ہار جائے وہ درخت پر چڑھ کر مرغے کی طرح اذان دے۔ ایک فریق کے سربراہ ندیم صاحب بنے اور ایک کے مولانا عبدالسلام ندوی (کوہاٹی) جب یہ شرائط طے ہو گئیں تو ادھر سے کسی نے شعر پڑھا تو اُدھر سے اس شعر کے آخری حرف کا شعر دوسرے فریق نے پڑھا۔ حافظے خوب خوب کام آئے۔ ایک مرحلہ ایسا آیا کہ "ندیم گروپ" مقابلے کا کوئی شعر پیش نہ کر سکا۔ سب کو یقین ہو گیا کہ اب ندیم صاحب درخت پر چڑھیں گے اور مرغے کی طرح اذان دیں گے کہ انھوں نے جھٹ ایک شعر گھڑ کر

پیش کر دیا اور مرغا بیچارے مولانا عبدالسلام ندوی کو بننا پڑا۔ جب مولانا (مع ریش مبارک کے) درخت پر چڑھے رہے بیٹھے تو لوگ دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ اور جب اذان دی تو سب مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئے۔

ندیم صاحب نے ہنسی پہ قابو پاتے ہوئے کہا: "مولانا آپ اذان دیتے ہوئے بڑے پیارے معلوم ہوتے ہیں۔"

مولانا نے اوپر ہی سے فرمایا۔ "ہر مرغی اپنے مرغے کے بارے میں بڑی خوش فہم ہوتی ہے۔"

اس کے بعد کبڈی کا پروگرام بن گیا۔ ہم لاکھ کہتے رہے کہ یہ کام اپنے بس کا نہیں لیکن جب ندیم صاحب نے بھی صاد کر دیا تو مجبوراً کھیلنا پڑا۔ ندیم صاحب نے قمیص وغیرہ اُتار دی۔ اور بنیان اور پتلون سمیت کھیلتے رہے۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں چیزوں میں سے کوئی نہیں اُتاری جا سکتی تھی۔ یوں تو اس کھیل میں سب کا مزا آیا۔ لیکن یہ تو دیکھنے والے ہوتے تھے۔ جب یہ بھاگتے ہوئے جاتے اور ایک دم کو ہاتھ لگا کر لوٹتے تھے تو ایک ہاتھ سے اپنی عینک تھامتے تھے اور ایک ہاتھ سے پتلون۔ شاید انھیں ان کے گرنے کا خطرہ تھا۔ اتنی احتیاط کے باوجود ایک مرتبہ ان کی عینک گر گئی۔ اور یہ "مر" گئے۔ تب انھوں نے عینک اُتار کر کھیلنا شروع کر دیا۔ پھر تو یہ کئی بار "مرے"۔ اس لیے کہ انھیں عینک کے بغیر دیکھنے کی عادت نہ تھی۔ ممکن ہے ٹھیک نظر نہ آتا ہو۔ عینک سمیت تو یہ خوب بھاگتے تھے۔ جانے انھوں نے عینک سمیت بھاگنے کی کب مشق کی تھی۔

ہم اتنا کھیلے اتنا کھیلے کہ تھک کے چُور ہو گئے۔ لیکن ہم میں سے کسی فریق نے ہار نہ مانی۔

جب ایک "پکڑ" میں ندیم صاحب کی پتلون پھٹ گئی تو متفقہ فیصلے کے مطابق کھیل بند ہوا۔ میں تو اس رات سو نہ سکا۔ جوڑ جوڑ میں درد ہوتا رہا۔ ندیم صاحب سے بھی دو تین روز ملاقات نہ ہوئی۔ جب چوتھے روز ملے۔ تو انھوں نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے مدھم آواز میں "ہائے" کہا۔

میں نے ان سے پوچھا "خیریت؟"

کہنے لگے "بھئی مجھے تو کبڈی ہوگئی ہے۔ میں تو ہلنے تک سے عاجز ہوں۔"

پھر تھوڑی دیر کے بعد رونی سی آواز میں کہا ـــــ "ہائے! میں مرگیا۔"

احمد ندیم قاسمی کی شخصیت پر کوئی سمجھدار لکھنے والا ہوتا تو وہ صرف ایک فقرہ ہی لکھ کر اپنا کام چلا سکتا تھا۔ وہ یہ کہ ـــــ "بڑے شریف آدمی ہیں" ـــــ اور اس کے بعد اطمینان سے ایک سو صفحے خالی چھوڑ دیتا تاکہ کسی کو بدہضمی ہی کی شکایت ہو جاتی۔ تو وہ ان خالی صفحات میں اپنی طرف سے ان کی شرافت کے تذکرے لکھ سکتا۔

شوکت صاحب

شوکت تھانوی کی شخصیت بڑی دلکش اور پیاری ہے۔
مگر عجیب و غریب بھی۔

قبل اس کے کہ میں زبان کھولوں۔ کیوں نہ پہلے آپ اُن کی رائے خود اپنے بارے میں سُن لیں۔ اس سے کچھ اور فائدہ ہو یا نہ ہو مجھے یہ فائدہ ضرور پہنچے گا کہ شوکت صاحب مجھ سے ناراض نہ ہوں گے اور آپ بھی مجھے یہ کہہ کر بخش دیں گے کہ جب خود "بدولت" کی اپنے متعلق یہ رائے ہے تو پھر کسی اور پہ کیا دوش، جبکہ دوسرے رائی کا پہاڑ بنانے کے بھی عادی ہوں۔ میں اپنے اُوپر ہزار تہمتوں کو بہ خوشی قبول کر سکتا ہوں سوائے اس کے کہ میرا شمار رائی کا پہاڑ بنانے والوں میں ہو۔ مجھے عین خوشی ہو گی کہ میں اس مضمون کے سلسلے میں رائی کی رائی اور پہاڑ کا پہاڑ بنا کر پیش کر سکوں۔

مولانا شوکت تھانوی اپنی ذات کے بارے میں فرماتے ہیں:

اس[1] سے بڑھ کر اور حماقت کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کو پیش کر دیں۔ اب یہ کہنے والا کوئی بھی نہ ہوگا کہ خدا نے اس کو سچ بولنے کی توفیق عطا کی۔

کوئی کہے گا "سن لیا آپ نے یہ جو آپ کے شوکت تھانوی ہیں۔ اسطلے درجے کے جواری واقع ہوئے ہیں"

کسی طرف سے آواز بلند ہوگی "بدمعاشیوں کے سوا اور کچھ کیا ہی نہیں"

ذرا فن کے بارہ میں بھی ان کی رائے معلوم ہو جائے تو مجھے دو لفظ لکھنے میں اور آسانی ہوگی۔

بچو![2] یہ شاعر بھی ہیں جب سنجیدہ کلام رو رو کر پڑھتے ہیں تو سننے والوں کو ہنسی آجاتی ہے۔ خدا کیلیے ان کو سمجھاؤ کہ یہ ترنم سے کلام سنانا چھوڑ دیں۔ اور اگر شاعری ہی ترک کر دیں تو تم سب مل کر یوم نجات مناؤ۔

بچو! ان کے مزاحیہ مضامین پڑھ کر اگر تمھیں ہنسی نہ آئے تو اپنے کو سمجھدار سمجھنا۔ اور اگر ہنسی آجائے۔ تو کسی فقیر سے اپنے لیے تعویذ لکھوانے کی کوشش کرنا۔ بعض لوگ شوکت تھانوی کو مزاح نگار کہتے ہیں اور بعض طنز نگار۔ اور اس قسم کے لوگ بہت کم ہیں جو طنز اور مزاح کا فرق سمجھ سکیں۔ وہ بھی سمجھتے ہوتے تو نہ انھیں طنز نگار کہتے، اور

---

[1] ماہنامہ دولت صفحہ ۱۱، ۱۲۔ [2] نقوش نمبر ۳۱، ۳۲ صفحہ نمبر ۹

"نہ مزاح نگار"

سُن لی آپ نے ان کی رائے خود اپنے بارے میں اب اگر میں نے یہ ٹھان بھی کر رکھا ہو کہ شوکت صاحب کے خلاف ہی مضمون لکھوں گا۔ پھر بھی اُس سے زیادہ کیا لکھوں گا جو خود انھوں نے اپنے متعلق فرما رکھا ہے۔ لہذا مجھے اُن کی رائے سے بھٹکنا نہیں چاہیے۔ ورنہ یہ مضمون دو کوڑی کا نہ رہے گا۔

جہاں تک ان کے مزاح نگار ہونے کا تعلق ہے۔ میں اس پر ایمان رکھتا ہوں اگر آپ ان کی اس خصوصیت سے بھی منکر ہیں تو یہ بڑی زیادتی ہے۔ آپ کی رائے اپنی جگہ برحق بھی ہو، تو میری بات مان لیجئے کہ یہ مزاح نگار ہیں۔ اگر آپ نے میری یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تو میری اور ان کی دل شکنی ہو گی۔ اور دل شکنی کسی بھی صورت میں اچھائی کا درجہ حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ لاکھ کہیں کہ میں مزاح نگار نہیں ہوں لیکن یہی بات اگر آپ نے دُہرا دی، تو شوکت صاحب ناراض ہو جائیں گے بفرضِ محال وہ ناراض نہ بھی ہوں، تو بھی یہ سوچئے کہ اگر شوکت صاحب مزاح نگار نہیں ہیں۔ تو پھر آج کون ہے مزاح نگار؟

پاکستان اور بھارت میں مزاح نگاروں کا قحط ہے۔ اگر میری حکومت کی مالی اور سیاسی حالت اچھی ہوتی، تو میں اس سے درخواست کرتا کہ وہ دو چار مزاح نگار ضرور امپورٹ کرے۔ تاکہ ہماری صحتوں پر اچھا اثر پڑے۔ اس لیے کہ ہم تو ایک ہی طرح کی غذا کھاتے کھاتے عاجز آ گئے ہیں۔

یوں تو ان میں بے شمار خوبیوں کے ساتھ ساتھ اَن گنت بُرائیاں بھی ہیں لیکن سب سے

بڑی خرابی یہ ہے کہ بے تحاشا لکھتے ہیں۔ یعنی سب کے سب مزاح نگاری کا ٹھیکہ اکیلے ہی ختم کر ڈالتے ہیں۔ باقی بیچارے منہ تکتے رہ جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ایک صاحب تو اپنی حق تلفی کے اظہار کے طور پر امریکہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ دوسرے علی گڑھ میں نا سمجھوں میں سمجھ پیدا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ چند ایک تو کڑھتے کڑھتے مر ہی گئے۔ اُن باغیرت حضرات میں عظیم بیگ چغتائی اور فرحت اللہ بیگ کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ اب سرحد پار ایک صاحب کنہیا لال کپور رہیں۔ اُن کا یہ اس لیے کچھ نہیں بگاڑ سکتے کہ وہ ہندو ہیں، اور خدا کو یہی منظور ہے کہ کوئی لاکھ زور لگالے۔ مگر ہندو اور مسلمان میں سے کسی ایک کو کسی طرح ختم نہیں کیا جا سکتا۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ آپ بے تحاشا لکھتے ہیں اور سوچنے سمجھنے کا موقع انھیں کم ملتا ہے۔ میں بھی چاہتا ہوں کہ انھیں سوچنے سمجھنے کا موقع کم ہی ملے۔ ورنہ یہ صرف سوچتے ہی رہ جائیں گے اور کچھ بھی نہ لکھیں گے۔ اور پھر ہوگا یہ کہ بڑے زوروں سے آبادی کم ہونی شروع ہو جائے گی۔ اس لیے کہ اس دُنیا میں ہمارے لیے قدم قدم پہ غم کے پہاڑ کھڑے ہیں۔ کوئی آدمی بھی تو مطمئن نہیں۔ بڑوں کو قوم کا غم کھا رہا ہے۔ اور چھوٹوں کو اپنا غم۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بڑے قوم ہی کو کھا رہے ہیں۔ لیکن میں یہ بات سُنی اَن سنی کر دیتا ہوں۔

اچھے مزاح نگاروں میں ایک پطرس نامی مزاح نگار گزرے ہیں۔ انھیں ایک بُری عادت یہ تھی کہ سوچتے زیادہ تھے اور لکھتے کم تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ نصف صدی کی عمر تک پہنچ کر بھی جو کتابچہ لکھ سکے، وہ بھی شوکت صاحب کی کسی ایک کتاب کی نصف

ہے۔ برخلاف اس کے شوکت صاحب کی تصانیف کی تعداد پوری سینچری نہ سہی، نصف سینچری تو ہے۔ بعض لوگوں کے ہاں ہر سال ایک بچّہ کی اوسط ہوتی ہے۔ ان کے ہاں ہر سال ایک کتاب کی اوسط ہے۔ کچھ لکھنے والے اپنی تصانیف کو ہی اپنی اولاد سمجھتے ہیں۔ اس لیے یہاں یہ نہ پوچھئے کہ ادیبوں کی "تصانیفی اولاد" کے علاوہ جو اولاد ہوتی ہے وہ کس کھاتے میں جائے گی۔

ان کی شاعری سے میرا بھی ناک میں دم ہے۔ نہ جانے انھیں اللہ نے ان کی کن بداعمالیوں کی یہ سزا دی کہ شوکت صاحب بھی شعر کہنے لگے۔ شعر موزوں کرلینا ان کا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ تو ہر یو۔پی میں پیدا ہونے والے کا حصّہ ہے۔ چونکہ یہ کچھ پڑھے لکھے ہیں۔ اس لیے کبھی کبھی کام کا شعر بھی کہہ نکلتے ہیں۔ اگر خدا نخواستہ اتنے بھی پڑھے لکھے نہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ یہ شعر و شاعری کے معاملے میں اپنا کوئی ثانی پیدا ہونے ہی نہ دیتے۔ اور اس پر ان کا ترنّم نورٌ علیٰ نور۔ بالکل ایسے سمجھئے، جیسے کوئی یورپین لیڈی اردو کی کوئی غزل گانے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس پر بھی آپ مشاعروں میں شرکت فرماتے ہیں۔ اس لیے کہ حکیم نے نسخے میں لکھ دیا ہے۔ میں بھی کوئی آٹھ دس مشاعروں میں ان کا کلام ان کے ترنّم سمیت سُن چکا ہوں۔ اور میں نے یہ دیکھا کہ سوائے دو ایک مشاعروں کے باقی سب میں بڑے اعلیٰ پیمانے پر ہوٹ ہوئے۔ مجھے چونکہ ان سے ایک دلآویز قسم کی ذہنی وابستگی ہے۔ اس لیے میں نے ہر بار یہ محسوس کیا ہے کہ بھرے مجمع میں مَیں ہی ہوٹ ہوا ہوں۔ اس لیے مجھے خودکشی کرلینی چاہیے۔ خدا کی شان دیکھئے کہ اب تک نہ شوکت صاحب نے خودکشی کی ہے اور نہ میں نے۔ نہ وہ شعر کہنے سے باز آئے اور نہ

ہیں انھیں اب تک یہ سمجھا سکا کہ حضور شعر و عر کہنا چھوڑ دیجیے ورنہ ڈر ہے کہ مجھے خودکشی پر راضی ہونا پڑے گا۔

ویسے یہ اتنے بھی گئے گزرے نہیں ہیں کہ شاعری میں استاد امام دین اور ترنم میں پنڈت آنند نرائن ملّا کو شرمانے لگے ہوں۔ یہ کئی نام کے شاعروں سے اچھا شعر کہتے ہیں۔ پھر بھی اگر یہ شعر نہ کہیں گے تو کونسا شعری ادب ڈوبا جاتا ہے۔ البتہ مجھے ان کی سنجیدہ شاعری سے مزاحیہ شاعری زیادہ پسند ہے۔ اس لیے کہ یہ سنجیدہ شاعری کرتے وقت خواہ مخواہ اپنے اوپر متانت طاری کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ اکثر اپنی سرشت کے مطابق آدمی کو آدمی کا بچہ یا آدھا کہتے ہی پکڑے گئے ہیں ایسی پر بھی سنجیدہ شاعری بات جچتی نہیں ___ ہزل میں یہ رفیع احمد خان کے مرید۔ وہ رفیع احمد خان جن کے شعر سن کر علامہ اقبال جیسا ٹھوس آدمی پھڑک اٹھا تھا۔ اگر آپ کی ان سے یاری ہے تو شوکت صاحب سے ان کے اس نوع کے شعر سنیئے مزے آجائیں گے۔ دنیا بھی سنور جائے گی اور عاقبت بھی۔ اگر ذرا بہکے تو یہ سمجھ لیجیے کہ دنیا بھی خراب اور عاقبت بھی۔ نہ جانے خود ان کی عاقبت اور دنیا کا کیا حال ہے اور ہوگا۔

مضمون شروع کرنے سے پہلے اگر میں اُن کا حلیہ بیان کر دیتا تو زیادہ مناسب تھا۔ چونکہ اس زمانے میں کوئی بات بھی مناسب طریقے سے نہیں ہو رہی۔ اس لیے یہاں عرض کر دوں تو کچھ حرج بھی نہ ہوگا۔

ان کا رنگ تو ہے گندمی (اگر میں ہلکا سیاہ کہوں گا تو ان کی ہوگی سبکی) قد اچھا خاصا مردوں جیسا ہے۔ نہ زیادہ اونچا نہ ناٹا۔ بلکہ خوبصورت قد۔ ناک کو لمبی کہوں

تو بھی غلط، چپٹی کہوں تو بھی غلط۔ اس لیے معاملہ بین بین سمجھئے۔ البتہ ناک ذرا اور شمالی جنوب کو پھیلتی تو آپ بے دھڑک چپٹی ناک کا خطاب دے سکتے تھے۔ اب احتیاط لازم، دانت خاصے خوبصورت تھے۔ مگر یہ اس رفتار سے پان کھاتے رہے ہیں کہ آخر کب تک بھلے لگتے رہتے، چہرہ پہ عینک پہلے چہرے پر مونچھیں بھی ہوتی تھیں۔ درمیان میں غائب ہو گئیں۔ اب پھر اپنا جلوہ دکھانے لگی ہیں۔ ویسے ان کے چہرے کی اس چیز کا کوئی اعتبار نہیں۔ نہ جانے کب غائب ہو جائے اور کب نمودار۔

یہ بلا کی دلفریب اور محبوب شخصیت رکھتے ہیں۔ ان کی موجودگی میں بڑے سے بڑا فقرے باز بھی نہیں ٹِک سکتا۔ نتیجتاً محفل کی محفل زعفران زار بن جاتی ہے۔ یہ بڑے گنہگار ہیں۔ اگر قدرت نے انھیں بخشا تو اس کا سبب ان کی شخصیت کا یہی رُخ ہوگا۔ بات میں سے بات پیدا کر لیتے ہیں۔ لفظی رعایتوں کا جتنا زیادہ فائدہ اٹھاتے ہوئے میں نے انھیں دیکھا ہے اور کسی کو نہیں دیکھا۔ طرزِ بیان میں بھی بلا کا حسن۔ اب تو ماشاءاللہ آپ ایکٹنگ بھی فرمانے لگے ہیں۔ سُنا ہے کہ انھوں نے ایکٹنگ بھی خوب کی ہے۔ چشم بد دور!

قاضی جی بھی تو ان کی ایکٹنگ کی ایک رنگا رنگ تصویر تھی۔ کاش وہ تصویر مستقل نہ ٹنگی رہتی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ہوائی مُدّاح ان کی صلاحیتوں کا کچھ غلط اندازہ لگا رہے ہیں۔ ورنہ وہ ان کے ذمّہ کوئی اور کام کر کے ان کے مزید جوہر دیکھتے۔

ہاں تو بات یہ ہو رہی تھی کہ یہ بلا کی دلفریب مجلسی شخصیت ہیں۔ ان کے قصے سنتے جائیے اور ان کی مغفرت کے لیے دعا مانگتے جائیے۔

سُنا ہے کہ یہ پچھلے دنوں مع اپنی بیگم صاحبہ کے کراچی جا رہے تھے جس ٹرین

ان کی سیٹ تھی۔ اُس کی ترتیب کچھ یوں تھی کہ نچلی دونوں سیٹوں میں سے ایک پہ یہ تھے اور ایک پہ ان کی بیگم، بیگم کے اُوپر والی سیٹ ایک بڑے موٹے تازہ آدمی کے حصے میں آئی تھی۔ جب سب اپنی اپنی سیٹوں پر براجمان ہوئے اور گاڑی چل دی، تو شوکت صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے اور اُن صاحب کو بڑے غور سے دیکھنے لگے۔ کبھی نیچے سے کبھی اُوپر سے، کبھی سر ہلاتے ہیں اور دونوں ہاتھ جوڑ کر اور منہ چھت کی طرف اٹھا کر کہتے ہیں

—"سبحان تیری قدرت، خوب چیز بنائی ہے تو نے بھی۔"

اس پر وہ صاحب کھسیانے ہو کر متوجہ ہوئے اور ان سے پوچھا۔ "آپ مجھ سے کچھ فرما رہے ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"ایں —"

"آپ کی نظر میں کوئی لڑکی ہے؟"

"خیریت؟"

"میں اُس سے شادی کروں گا۔"

"ارے صاحب آپ کی تو بیوی موجود ہے (اور نیچے ہاتھ کر کے) کیا یہ آپ کی بیوی نہیں ہیں؟

"ہیں تو"

"پھر؟"

سوچتا ہوں کہ جب آپ اُوپر والی سیٹ سے نیچے اُتریں گے، تو گریں گے ضرور

نتیجتہً میری بیوی شہید ہو جائے گی۔ اس سلسلے میں تو آنے والی گھڑی کے خوف سے کانپ رہا ہوں۔ اور اس کا ابھی سے کوئی انتظام بھی کرنا چاہتا ہوں۔"

روایت ہے کہ اس مکالمے پر ڈبے کا ڈبہ ہنس دیا۔ لیکن کسی نے اس طویل سفر میں اُن صاحب کو نیچے اُترتے نہیں دیکھا۔

ایک تو انھیں نئی نئی باتیں سوجھتی ہیں، پھر باتوں میں بلا کی برجستگی اور بعض اوقات زہر بھی۔

ان کی ہمشیرہ کی جب شادی ہوئی تو رواج کے مطابق لڑکے والوں نے انھیں خوب خوب بنایا۔ کوئی آکر ان کے کان میں چپکے سے کہتا ——

"آج آپ کی ہمشیرہ کی شادی ہے نا؟"

شوکت صاحب: "جی ہاں۔"

اُدھر سے ایک اور صاحب یہ کہتے ہوئے آئے: "جی آج آپ کی ——"

شوکت صاحب: "جی ہاں۔"

بالآخر دُولھا کی بغل سے بھی ایک صاحب نکل آئے اور فرمانے لگے: "آپ ہی دولھا کے سالے ہیں نا؟"

اس پر شوکت صاحب نے اُن حضرت کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور اُونچی آواز میں کہا: "آج ان صاحب سمیت مجھ سے کئی ایک نے پوچھا ہے کہ آج آپ کی ہمشیرہ کی شادی ہے۔ اس لیے میں نے مناسب سمجھا کہ آپ سب کے سامنے اقرار کر لوں کہ شادی میری ہی ہمشیرہ

کی ہے اور ہمارے ہاں رواج یہ ہے کہ جب لڑکی جوان ہو جاتی ہے تو ہم اس کی شادی کر دیتے ہیں۔"

شوکت صاحب کے ان ریمارکس کے بعد جیسے سب کو سانپ سونگھ گیا۔ پھر کسی کی کیا مجال کہ کوئی ان کے پاس سے گزر جائے۔ راوی ہیں اس کے شوکت صاحب کے بھائی مولانا ارشد تھانوی صاحب جو خیر سے ان کے بہنوئی بھی ہیں۔

ایسی باتوں سے ان کی زندگی بھری ہے۔ کہاں تک سنئے گا۔ اگر وہ ساری باتیں سنا بھی دی جائیں تو جو اصل اور نقل میں فرق ہے۔ وہ تو بہر حال رہے گا۔

آپ سوچتے ہوں گے کہ اتنا دلچسپ، اتنا ہنس مکھ اور ایسا باغ و بہار قسم کا انسان کبھی پریشان حال نہ ہوگا۔ لیکن آپ رہتے ہیں پریشان حال۔ میں اس کی وضاحت نہ کروں گا کہ پریشانیاں انھیں گھیرے رہتی ہیں یا یہ پریشانیوں کو گھیرے رہتے ہیں۔ بہر حال ان دونوں باتوں میں سے ایک نہ ایک بات ضرور ہے۔

ان کی طبیعت کی ایک اچھائی یہ بھی ہے کہ یہ بیٹھے بٹھائے ناراض ہو جاتے ہیں۔ نہ ناراض ہونے کا پلاٹ بناتے ہیں اور نہ کوئی اسکیم نہ ہی دوسرے کو یہ موقعہ دیتے ہیں کہ وہ بے چارا مدافعت ہی میں کچھ کہہ سکے۔ اگر آپ نے اس موقعہ پر کچھ کہہ بھی دیا تو یہ سنتے تھوڑی ہیں۔ بھئی سنیں بھی کیسے۔ کوتوالِ شہر کے بیٹے ہیں۔ اس معاملے میں میں ان کو کم اور والدِ بزرگوار کو زیادہ قصوروار ٹھہراتا ہوں —— یہ دوست برسوں میں بناتے ہیں۔ قطع تعلق ایک منٹ میں کر لیتے ہیں۔

جو ان کے نئے نئے یار ہوتے ہیں۔ وہ بڑے پریشان ہوتے ہیں۔ لیکن جنھیں ان

کی دیرینہ دوستی کا شرف حاصل ہے وہ زیادہ پریشان نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ انھیں علم ہے کہ ابھی شوکت صاحب کبھی پھر منہ نہ دیکھنے کا اعلان کر کے گئے ہیں۔ مگر کسی دن خود ہی اُسی پیار اور محبت سمیت آجائیں گے اور اس دن کی ناراضی کا ذکر تک نہ کریں گے۔ پھر ویسی ہی گھٹے گی۔ وہی لطیفے ہوں گے۔ وہی شوکت صاحب ہوں گے۔ شوکت صاحب کی ناراضی ایک دم بلب کا فیوز ہونا ہوتی ہے لیکن اس کے بعد خود ان کی وجہ سے ہمیشہ کے لیے گھُپ اندھیرا نہیں رہ سکتا۔ مجھے تو ان کے رُوٹھنے پر بڑا پیار آتا ہے۔ ایسے لوگ کہاں ملیں گے۔ جن کے رُوٹھنے میں بھی ایک معصومیت ہو۔ اگر ایسے لوگ ملتے ہیں تو مجھے کیوں نہیں ملتے۔ اگر آپ کو ایسی کسی شخصیت کا علم ہو تو مجھے اُس کا سراغ دیجئے۔ میں اُس سے دوستی کروں گا۔

آپ فرسٹ کلاس قسم کے بُزدل ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مزاح نگار ہیں۔ اگر اپنا دل مضبوط ہوتا تو لوگوں کو رُلانے پر بھی قادر ہوتے۔ اور پھر آپ شوکت تھانوی نہ ہوتے، علامہ راشد الخیری ہوتے ——

ذرا بادل گرجے، بجلی چمکے، پھر دیکھئے آپ کا مزا۔ نادری حکم کے ماتحت تمام کھڑکیاں اور دروازے بند کرا دیں گے۔ اس کے بعد خود اُٹھیں گے، چٹخنیاں دیکھیں گے کہ کہیں کوئی چٹخنی کھُلی تو نہیں رہ گئی۔ پہلے خود اُٹھنے کے بجائے دوسروں کو اس لیے حکم دیں گے، مبادا بجلی اندر گھس کر نبادلۂ خیالات کر ڈالے۔ پورے اطمینان کے بعد پھر لحاف لے کر پڑ رہیں گے۔ خواہ دن کے بارہ ہی کیوں نہ بجے ہوں۔

آپ خدا سے اتنا نہیں ڈرتے جتنا کہ سانپ سے۔ سانپ سے ڈرتے تو بھی ہیں۔

لیکن آپ تو سانپ کے ذکر تک سے ڈرتے ہیں۔ جس رات سُننے سے پہلے سانپ کا ذکر آجائے تو پھر طے کہ اُس رات آپ کو نیند نہیں آسکتی۔ بلکہ لیٹے لیٹے ہر لمحہ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اب آیا سانپ کہ اب' اب کمرے کے فلاں کونے سے نکل رہا ہے اب میری چارپائی کے نیچے پہنچا۔ اب وہ چارپائی پر چڑھ رہا ہے۔ اب یہ میرے بستر پر اور اب ـــ اب ـــ اسی اب میں رات کو صبح کر دیں گے۔

اگر رات کو کہیں کھٹکا ہو' تو یہ خود تھوڑی اُٹھیں گے۔ اُلٹا بیگم سے کہیں گے ـــ "سنتی ہو ذرا اُٹھ کے دیکھنا، کیا بات ہے' مجھے تو کچھ گڑبڑ نظر آتی ہے" اور جب بیگم اُٹھ کر دیکھیں گی اور انھیں بتائیں گی کہ بلّی تھی۔ تب ان کی گھگی بندھنا بند ہو گی اور لحاف ہی میں پڑے پڑے پھولی ہوئی سانسوں سے کہیں گے ـــ ہوں اوں ـــ اس کے بعد خاموشی ـــ تھوڑی دیر تک تو ڈاکو کے چلے جانے کا انتظار کریں گے۔ اس کے بعد سونے کی کوشش کریں گے، صرف کوشش!

یہ بات کہنے والی تو نہیں۔ لیکن آپ سُن لیں کہ یہ خدا کے بنائے ہوئے بُتوں کی بڑی پوجا کرتے ہیں۔ کامیابیوں کا حال خدا جانے یا شوکت صاحب جانیں۔ لیکن آپ ہیں "زبان ساز" "بات ساز" "مزاج ساز" اِس لیے اپنے مقاصد میں کامیاب ہی ہوتے ہوں گے۔ اس کا علم نہیں کہ خود بُت ان سے دلچسپیاں لیتے ہیں یا یہ بُتوں سے۔ اس ضمن میں ایک قصّہ یہ خود لکھ کر چھپوا چکے ہیں۔ اس لیے اسے دہرا دینے میں کیسا حرج ہو گا۔

"اب[1] وہ ہمارے یہاں مہمان ہو گئیں۔ ایک ہفتہ، دو ہفتے

[1] آبدولت صفحہ ۱۴۸

تین ہفتے، ایک مہینہ، دو مہینے، تین مہینے اور ایک دن یہ کہہ کر
کہ جب میں بھائی صاحب کہتی ہوں تو پھر پردہ کیسا، سامنے
آگئیں۔ نہایت حسین و جمیل، نہایت تیز طرار اور نہایت خوش مذاق،
اس لیے ہم پر یا بیوی پرسان کا اس قدر جم کر رہنا ہر گز بار نہ تھا کہ خود
ہم کو ایک دن بھی بات سے ڈھیل۔ اُدھر سے پسندیدہ تعریف،
اِدھر سے ان کی پذیرائی، شیطان نے دونوں کو اپنی آغوش میں لے کر
اس قدر بھینچا کہ دونوں ایک ہو گئے۔"

میں تو اس کو بھی کردار کی ایک بڑائی سمجھتا ہوں کہ یہ جھوٹے تقدس کے قائل نہیں۔ اپنی لغزشوں پہ نازاں ہیں۔ بلکہ وہ سادہ سے الفاظ میں یہ کہتے ہیں کہ "بھئی میں آپ جیسا انسان ہوں۔ آپ میں اور مجھ میں فرق اتنا ہے کہ آپ جھوٹے تقدس کی آڑ میں وہ کچھ نہیں کہتے جو آپ ہیں۔ میں تو ایک کھلی ہوئی کتاب ہوں۔ جہاں سے چاہے پڑھ لو۔ اور ایک انسان کی زندگی میں اور میری زندگی میں کوئی فرق نہ پاؤ گے۔

آپ بڑے مذہبی قسم کے آدمی ہیں۔ کسی زمانے میں تو چہرے پہ داڑھی بھی تھی۔ البتہ آپ عام قسم کے مولویوں کی طرح تنگ نظر نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آپ روزے کے کم اور افطاری کے زیادہ قائل ہیں۔

آخر انسان ہیں، اس لیے بھول چوک بھی ہو جاتی ہے۔ اس بھول کی یادداشت میں آپ نے پچھلے برس ایک روزہ رکھا تھا۔ روزہ کیا تھا قیامت ڈھا دی تھی، اوّل تو آپ دفتر نہ گئے۔ بارہ بجے تک تو مزاج بھی ٹھیک تھا پھر لگے بیگم سے لڑنے کبھی بچوں کو

مارنے۔ بیگم نے بچوں کو چھپا دیا اور خود بھی کوشش کرنے لگیں کہ کہیں چھپ جائیں۔

جب انھوں نے یہ دیکھا کہ گھر کا آدمی سامنے نہیں آ رہا تو انھوں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا۔ پہلے تو کمرے میں بچھے ہوئے قالین اُٹھائے، پھر کرسیاں ایک طرف رکھ کر پانی کی بالٹیاں بھر بھر کے لاتے رہے اور کمرہ دھوتے رہے۔ کوئی پون گھنٹہ تک یہ شغل جاری رکھا۔ جب فرش خوب ٹھنڈا ہو گیا۔ تو آپ لنگوٹ کس کر ٹھنڈے فرش پر لیٹ رہے۔ تاکہ ٹھنڈک پہنچے۔ پھر بار بار گھڑی کی طرف دیکھتے اور گھڑی کمبخت تھی کہ ان کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔ حتیٰ کہ ان کی نیم بیہوشی کے وقت افطاری ہوئی۔ تب انھوں نے ہاتھ اُٹھا کر خدا کے حضور دعا مانگی کہ تو جسے توفیق دے، وہی روزہ رکھ سکتا ہے۔ آج مجھ سے فاش غلطی ہوئی۔ آئندہ کبھی نہ ہو گی۔ لہٰذا تو میری اس لغزش کو معاف فرما، تو نے سب گنہگاروں کے گناہ بخشے ہیں، ایک میرا بھی سہی! — ایک میرا بھی!

بچوں کی طرح یہ ضد بھی کرتے ہیں اور بڑوں کا سا حوصلہ بھی رکھتے ہیں بعض اوقات یہ کسی معمولی سی بات پر اَڑ جائیں گے! اور دنیا جہان ایک کر کے اس بات کو منوا کے رہیں گے۔ کبھی کبھی بڑی بات کو بھی ہنس کر ٹال جائیں گے۔ یہ ایک انسانی کمزوری اور یہ ایک انسانی ہی خوبی ہے۔ سُنا ہے کہ یہ کمزوروں کے معاملے میں اَڑ جاتے ہیں، اور شہزوروں کے معاملے میں ہنس دیتے ہیں۔ ہنسنا تو ان کی فطرت ہے۔ لیکن دبنا ان کی فطرت نہیں۔

کمزوریاں سب میں ہوتی ہیں۔ لیکن نوعیتیں مختلف ہوتی ہیں۔ شوکت صاحب جب اپنی کمزوری کا ذکر کرتے ہیں۔ تو اُسے ایک عجیب ڈرامائی انداز میں پیش کرتے ہیں، اور اس

پلاٹ میں اتنے ایچ پیچ ہوتے ہیں کہ آپ کی نگاہ اُس پلاٹ کے ہر رُخ کو نہیں دیکھ پاتی اُلٹی آپ کو ان سے ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ ایسے موقعوں پر دل میں کہتے ہوں گے کہ دیکھا کیسا بیوقوف بنایا۔ یقین کیجئے کہ یہ اس طرح اپنے سب کے سب دوستوں کو بیوقوف بنا چکے ہوں گے ایسے بیوقوفوں میں میرا نام سرِ فہرست لکھا جا سکتا ہے۔

ان کی ایک چھوڑ دو بیویاں ہیں۔ اس طرح اُنھوں نے شادی کے معاملے میں اسلام کی آدھی رعایت سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ وہ تو اب تک پوری رعایت سے فائدہ اُٹھا چکے ہوتے۔ بشرطیکہ ان دو ہی بیویوں نے انھیں کچھ کس کے نہ رکھ دیا ہوتا۔ اب یہ ہر لمحہ سوچتے ہیں کہ اُدھر اسلامی احکامات کی تکمیل ضروری ہے۔ اِدھر بیویوں کی شہ زوریاں ہیں۔ کروں تو کیا کروں ــــ جس دن شاہ ابن سعود کے انتقال کی خبر کے ساتھ انھوں نے یہ پڑھا ہوگا کہ موصوف بیویوں کے علاوہ ڈیڑھ سو کے قریب لونڈیاں بھی چھوڑ مرے تو ان کے سینے پر سانپ لوٹ لوٹ گیا ہوگا۔

اس ترقی یافتہ دَور میں کوئی یہ کہہ دے کہ شاہ ابن سعود نے اس ضمن میں جو کچھ کیا تھا۔ وہ انسانیت کے سراسر خلاف تھا۔ تو اسلام پر حرف آتا ہے اور اُس حدیث کا بھی خیال آتا ہے کہ مرنے کے بعد ہر مسلمان کو اچھائیوں سے یاد کرنا چاہیئے۔ تو مجھے بحیثیت مسلمان کے اس مسئلے میں گنگ ہونا چاہیے۔ لہذا مجھے گنگ سمجھیے۔

میں نے آج سے بارہ برس پہلے جیسے شوکت صاحب کو دیکھا تھا۔ ویسے ہی یہ آج بھی جوان ہیں۔ بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم نے جیسا انھیں آج سے بیس برس پہلے دیکھا تھا ویسے ہی آج بھی ہیں۔ تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے اور سوچتا ہوں کہ یہ آج کے بیس برس بعد

بھی جب حسبِ سابق ہوں گے اور ہم بوڑھے، تو انھیں برخوردار کہتے ہوئے کیسا عجب لگے گا۔

آپ بڑا رواں لکھتے ہیں۔ بغیر ایک لفظ یا ایک نقطہ کاٹے لکھتے ہی جاتے ہیں۔ پھر خط اتنا پاکیزہ کہ اُسے پڑھنے کے بجائے چومنے کو جی چاہتا ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی لکھنے والے کا اتنا صاف اور خوشخط مسودہ نہیں دیکھا۔ بہ عام طور پر لکھنے سے کنّی کتراتے ہیں۔ اور جب لکھنے پر آتے ہیں تو دو تین دن سے لے کر ہفتہ بھر تک ایک ناول لکھ ڈالتے ہیں۔ ان کا ایک واقعہ تو مجھے آج بھی حیرت میں ڈال دیتا ہے۔

۱۹۴۵ء کی بات ہے کہ انھوں نے مجھے لکھنؤ سے خط لکھا کہ لکھنؤ آجاؤ۔ میں نے ایک ناول لکھا ہے، وہ آکر لے جاؤ۔ ساتھ ہی آم کھا جاؤ۔ جب بھی میرے سامنے کبھی آموں کا ذکر آیا ہے تو میں پھسل پڑا ہوں۔ میری یہی پھسلن مجھے لکھنؤ لے گئی۔ پہنچتے ہی جب میں نے ناول کا مطالبہ کیا کہ لائیے ناول، تو کہنے لگے جب جانے لگو گے تو لے لینا۔ چنانچہ وہ دن بھی آگیا۔ جب میں نے ان سے کہہ دیا کہ میں کل لاہور جا رہا ہوں۔

شام کا کھانا کھانے کے بعد انھوں نے قلم، دوات اور کاغذ میرے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا کہ لکھو ناول۔ تو میں سمجھا مذاق کر رہے ہیں۔ جب میں متواتر چار پانچ گھنٹے لکھتا رہا اور یہ زبانی لکھواتے رہے تو مجھے یقین ہوا کہ یہ مذاق نہیں تھا۔ آخر میں کہاں تک لکھتا۔ لکھتے لکھتے ہاتھ دُکھنے لگے۔ تو میں نے ان سے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اُس وقت رات کے بارہ بجے ہوں گے۔ لیکن یہ ایک صاحب کو جاکر پکڑ لائے۔ اور ان سے لکھنے کو کہا۔ وہ بے چارے بھی آنکھیں ملتے ملتے لکھتے رہے۔ جب وہ بھی تین چار

گھنٹے کے بعد آوٹ سو گئے تو پھر میری باری آئی۔ چنانچہ اس طرح رات بھر شوکت صاحب لکھواتے رہے اور ہم لکھتے رہے اور جب صبح ان کا نوکر چائے لے کر آیا تو ڈھائی سو صفحات کا ناول ختم تھا۔ اس ناول کا نام "بیوی" ہے۔

اس ناول میں اور ان کے دوسرے ناولوں میں معیار کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔ یہ اتنی بڑی خوبی ہے کہ آج اردو کے کسی بھی لکھنے والے کو نصیب نہیں۔ وہی پلاٹ میں ربط ہے۔ وہ پیاری پیاری سی رواں زبان ہے۔ وہی شگفتگی ہے۔ جو ان کے دوسرے ناولوں میں ہے۔

آپ کو عجیب عجیب شرارتیں سوجھتی ہیں اور آئے دن سوجھتی ہیں۔ ایک بار: ارشد تھانوی صاحب نے بتایا کہ انھوں نے ایک مرتبہ مجھ سے خوب انتقام لیا۔ قصہ یہ تھا کہ میں ان سے بڑا تھا۔ اس لیے میں انھیں ہر وقت ڈانٹا کرتا تھا۔ کبھی کہتا کہ تم پڑھنے لکھنے کے بجائے کھیل کود میں زیادہ وقت ضائع کرتے ہو۔ کبھی پوچھتا۔ کل رات تم اتنی دیر تک کہاں رہے — کبھی ڈانٹ پلاتا کہ خبردار جو کبھی پھر ایسے بال بنائے — میری انہی باتوں سے شوکت مجھ سے چڑے ہوئے تھے۔

فلاں سنہ کی بات ہے کہ میں لکھنؤ سے بھوپال جا رہا تھا۔ یہ حضرت مجھے گاڑی پر چھوڑنے آئے۔ میں باہر پلیٹ فارم پر ٹہلتا رہا۔ اور یہ میرا بستر بچھانے کے بعد قریب بیٹھے ہوئے ایک صاحب سے کہہ گئے کہ باہر جو فلاں صاحب ٹہل رہے ہیں۔ ان کا دماغ خراب ہے۔ اس لیے بھوپال کے اسٹیشن تک ان کا خیال رکھنا۔ ایک تو ان کے قریب نہ آ بیٹھے گا۔ دوسرے انھیں کھڑکی کی طرف نہ جانے دیجئے گا۔ مبادا چھلانگ

لگا دیں۔ ویسے تو ان کا علاج معالجہ کرایا گیا ہے اور پہلے سے کافی افاقہ بھی ہے۔ پھر بھی اس عارضہ کے بعد یہ اُن کا پہلا سفر ہے۔ لہذا اُن کا پورا پورا خیال رکھیے گا اور ان کی کسی حرکت پر بُرا بھی نہ مانئے گا ــــ اور ذرا دور ہٹ کے بیٹھ جائیے گا۔ مبادا تھپڑ وپڑ رسید کر دیں۔

جب گاڑی چلنے کا وقت آیا۔ تو میں ڈبہ میں آکر بیٹھا۔ سب مجھ سے کافی کافی فاصلے پر ہو کر بیٹھ گئے۔ دو تین منٹ میں خاموش رہا پھر ذرا بڑھ کے جو میں ایک صاحب کے ہاتھ سے اخبار لینے لگا تو وہ یہ سمجھے کہ یہ لگا ہے تھپڑ مارنے۔ لہذا انھوں نے مجھے بڑے زور سے ڈانٹ دیا۔ خبردار جو ہاتھ بڑھایا۔ میں سمجھا کہ یہ صاحب پاگل ہیں لہذا خاموش ہو گیا۔

پھر دو ایک اسٹیشن گزرنے کے بعد میں بکس میں سے کتاب نکالنے کے لیے اٹھا تو دو ایک آدمیوں نے آکر مجھے تھام لیا اور کہا کہ "خبردار جو اپنی جگہ سے ہلے" میں بڑا پریشان ہوا کہ یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے۔ نہ جانے یہ سب کے سب چور ہیں، ڈاکو ہیں، یا پاگل ہیں ــــ میں ان سے لاکھ کہتا کہ بھئی آپ لوگ مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں تو وہ مجھے جواب میں یہی کہتے کہ بس خاموشی سے سو جاؤ یا چپ چاپ بیٹھے رہو۔ خبردار جو کوئی حرکت کی۔

آخر میں گھنٹوں چپ چاپ بیٹھا رہا۔ اور وہ سب کے سب میری طرف ٹکٹکی باندھے میری تمام حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرتے رہے۔ یوں تھا تمام بدھ ہنسے بنسے میں کافی پریشان ہو چکا تھا۔ اس لیے سوچا کہ ذرا سر ہی کھڑکی سے باہر نکال دیکھوں۔ اِدھر

میں نے سر باہر نکالا۔ اُدھر دو تین آدمی مجھ پر جھپٹے کہ جیسے میں چھلانگ ہی لگانے والا تھا۔ جب انھیں یقین ہو گیا کہ میں اب چھلانگ نہیں لگاؤں گا تو وہ اپنی اپنی جگہ پر آکر بیٹھے۔

آخر جب میں نے اُن سے رونی سی صورت بنا کر کہا کہ "آپ حضرات مجھے کیوں پریشان کر رہے ہیں تو اُن میں سے ایک صاحب بولے۔ "ہمیں سب معلوم ہے۔"

"آخر کیا معلوم ہے؟"

وہ صاحب۔ "کہ آپ پاگل ہیں۔"

"میں پاگل ہوں۔"

"جی ہاں۔"

"بھئی یہ آپ سے کس نے کہہ دیا۔"

"انہی صاحب نے جو آپ کو اسٹیشن پر چھوڑنے آئے تھے۔"

آپ کو اپنی ظاہری آن بان کا بڑا شوق ہے۔ اچھا سے اچھا کپڑا پہننے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر طرف ان کی عزت اور شہرت ہے اگر کہیں عزت اور شہرت نہیں بھی ہے۔ تو بھی یہ چاہتے ہیں کہ وہاں بھی مجھے اسی نظر سے دیکھا جائے اور لوگ میری ہر ہر بات پر آمنّا و صدّقنا کہیں۔ اور واہ وا کے ڈونگرے برسائیں۔ یہ بڑے خوش قسمت ہیں کہ انھیں زندگی میں اچھے اچھے چانس ملے اور انھوں نے خوب ٹھاٹھ سے زندگی گزاری۔ ورنہ آج کل کے ادیبوں کی جو حالت ہے، وہ خدا کسی کو نہ دکھائے

بس ذرا سے احساسِ کمتری کے شکار ہیں۔

اب ان کا ایک اور قصّہ سن لیجیے اور اس کے بعد مجھے اجازت دیجیے گا۔

ایک دن ہمارے دفتر میں ایک شاعر تشریف لے آئے اور ان کی تفریح کا سامان بن گئے۔ وہ بھی صرف شاعر ہی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے پاس عقل کم اور شعر زیادہ تھے۔ چنانچہ خوب بنے اور انھیں اس کا مطلق احساس نہ ہوا کہ "بنائی" ہو رہی ہے۔ انھوں نے آتے ہی شوکت صاحب سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ "آپ مجھے جانتے ہیں؟"

"جی ہاں پرسوں رات ہیرا منڈی میں ملاقات ہوئی تھی۔"[1]

"جی وہ میں نہ تھا، کوئی اور صاحب ہوں گے۔ میرا نام تو قربان الدین شہید ہے۔"

"واہ وا نام کی مناسبت سے کیا عمدہ تخلص چنا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ آپ شعر بھی کہتے ہیں۔"

"جی ہاں جھک مارتا ہوں۔"

"تو پھر جھک ماریئے، فی کس ایک غزل ہو جائے۔"

چنانچہ وہ صاحب شروع ہو گئے۔ غزل پر غزل، ہر غزل کے بعد شوکت صاحب ساتھ ساتھ کہتے جائیں۔ یہ ہوئی فلاں صاحب کی، اب یہ ہوئی فلاں کی۔ جب اُن کی اپنی باری آئی تو کہنے لگے۔ دیکھیے شہید صاحب میرے نام پہ دو غزلہ ہو جائے۔ یہ سنتے ہی ہم میں سے ایک صاحب مارے ہنسی کے وہاں سے ٹلنے لگے تو انھوں نے کہا۔ "بھئی مت جاؤ، شہید صاحب غزل نہیں سنائیں گے۔"

۱ـ لاہور میں طوائفوں کا بازار

سب اتنا ہنسے کہ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ تھوڑی دیر خاموشی رہی تو شوکت صاحب نے ان سے پوچھا، اپنا دیوان چھپوا ڈالیں۔ اس پر شہید صاحب نے کمال بے نیازی سے کہا۔ "میں تیار ہوں۔ بشرطیکہ کوئی پبلشر تیار ہو جائے۔"

شوکت صاحب نے کہا۔ "واہ تیار کیوں نہیں ہوں گے۔ میں اپنی کتابیں پانچسو روپے فی کتاب کے حساب سے چھپواتا ہوں"

شہید صاحب نے کہا۔ "میں تو تین سو پر بھی تیار ہوں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اگر مجھے تین سو بھی مل جائیں تو مجھے عذر نہ ہوگا۔"

شوکت صاحب نے بڑی حیرت سے کہا۔ "پھر آپ کی کتاب کبھی بھی نہ چھپے گی۔ میں تو ایک کتاب کا مسودہ تیار کر کے پبلشر کے پاس جاتا ہوں۔ تو پانچسو روپے اپنی گرہ سے دے کر آتا ہوں۔ آپ اُلٹے پبلشر سے مانگتے ہیں۔ بھئی سبحان اللہ!"

"اچھا یہ بات ہے تو پھر میری کتاب واقعی نہ چھپے گی۔ میری تو کل تنخواہ تین سو روپے ہے۔ اور یہ رقم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو ناگزیر بیگم کی ہتھیلی پر رکھنی پڑتی ہے۔"

"دیکھئے شہید صاحب! یہ تو کتاب نہ چھپوانے کے بہانے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو کتاب نہ صرف چھپ سکتی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ جب تنخواہ ملے تو گھر جا کر بجائے تین سو کے دو سو دیجئے اور بیگم سے کہیے اب کے میری پچھلے برس ترقی ہوئی ہے۔ اسی طرح پانچ مہینے تک بیوی کو

بیوقوف بناکر اور اپنا مجموعہ چھپوا کر عقلمندی کا ثبوت دیجئے۔

اس کے بعد تھوڑی دیر کے لیے خاموشی ہوگئی۔ شاید وہ یہ سوچ رہے ہوں کہ اگر میرا مجموعہ نہ چھپا تو اُردو ادب یتیم ہوجائے گا۔ یہی سبب تھا کہ انھوں نے ایک لمبے سکوت کو ایک بہت ہی لمبی "ہوں" سے توڑا۔ اور شوکت صاحب نے دھیرے سے پھر پوچھ لیا۔ "آپ ایک غزل میں کتنے شعر کہتے ہیں اور پھر اُن میں سے کتنے شعر انتخاب کرتے ہیں؟"

"جی میں عموماً اُنیس شعر کہتا ہوں اور اُن میں سے سات منتخب شعر رکھتا ہوں۔"

اس پر شوکت صاحب نے جھٹ کہا۔ "جی جی! ــــ میں بھی کہوں بات کیا ہے۔ اب میں کل سات شعر کہتا ہوں اور اُن میں سے اُنیس شعر کہتا ہوں۔"

اس پر تمام بیٹھے ہوئے حضرات مارے ہنسی کے اُٹھ اُٹھ کر جانے لگے ــــ اور شہید صاحب ان سے پوچھ رہے تھے ــــ "کیا مطلب؟"

جگر صاحب

ٹھیک ٹھیک دوپہری تھی، وہ بھی لکھنؤ کی۔ میں خوب مزے سے سویا ہوا تھا اس لیے کہ پنکھا اور پسینہ ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ اہلِ لکھنؤ کی طرح نہ دھوپ میں لطافت تھی نہ نزاکت، نہ جانے اللہ میاں نے دھوپ کے سلسلے میں لکھنؤ والوں کے شاعرانہ مزاج کا خیال کیوں نہیں رکھا۔ دھوپ کے ساتھ لُو بھی سونے پر سہاگہ، حالانکہ چاہیے یہ تھا کہ وہاں کے رہنے والوں کے مذاق کے مطابق ہلکی سی دھوپ ہوتی۔ جسے اہلِ مذاق پیار سے "دھوپیہ" کہتے۔

لکھنؤ کی سرزمین ہی ایسی ہے کہ وہاں آپ کو قدم قدم پر شاعر ملیں گے۔ بعض دانشوروں کا خیال یہ ہے کہ وہاں سب سوتے اور جاگتے میں شعر ہی کہتے اور شعر ہی سنتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر مجھ پر بھی یہ اثر ہوا کہ سوتے ہی سوتے شعر سنے۔ اگر میں کہوں کہ میں نے سوتے سوتے صرف شعر ہی سُنے تو یہ کفرانِ نعمت ہوگا۔ میں نے شعر باترنم سُنے۔

اُن میں سے ایک شعر میں آپ کو بلا ترنم سناتا ہوں۔

اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں
فیضانِ محبت عام سہی عرفانِ محبت عام نہیں

میں بیدار ہونے کے مُوڈ میں نہ تھا۔ لیکن اس شعر کے ساتھ جو ترنم تھا۔ اُس نے کچھ کچھ آنکھیں کھول دیں۔ پھر دوسرا شعر نیم بیداری کی حالت میں آدھا سُنا آدھا اُونگھ گیا۔ تیسرے شعر نے خاصا چونکایا۔ رفتہ رفتہ نیند غائب تھی اور میں بیدار۔ پہلے خیال آیا کہ شوکت تھانوی صاحب اپنے اشعار جگر صاحب کی لَے میں پڑھ رہے ہیں (اس لیے کہ ان دنوں میرا قیام شوکت صاحب کے ہاں تھا) لیکن اس بات کا فیصلہ جلد ہی کر لینا پڑا کہ اشعار جگر صاحب ہی کے ہیں۔ ورنہ یہ اشعار جگر صاحب کے علاوہ کون کہہ سکتا تھا۔ خاص انہی کے رنگ کے اشعار تھے۔

کیوں محوِ نشاطِ عیش و طرب تکلیفِ توجہ فرمائیں
آوازِ شکستِ دل ہی تو ہے آوازِ شکستِ جام نہیں

آنا ہے جو بزمِ جاناں میں پندارِ خودی کو توڑ کے آ
اے ہوش و خرد کے دیوانے یاں ہوش و خرد کا کام نہیں

میں ذرا کھنکارا تو پاؤں میں لپٹی ہوئی آواز آئی "کون ہے؟" ساتھ ہی زیرِ زبان شعر کو بھی پورا نہ کیا گیا۔ "پینے کو تو سب پی (پیتے ہیں جگر ——) تک ہی معاملہ رُک گیا کہ اتنے میں شوکت صاحب نے آواز دی۔

"بھئی طفیل جاگ رہے ہو۔ ادھر آؤ تمھیں ایک چیز دکھائیں۔"

میں ادھر کر دوسرے کمرے میں آیا تو چیز کی بجائے جگر صاحب کو دیکھا۔ اور اس وقت کھلن ہے والی بات بھی سمجھ میں آئی۔ اس لیے کہ جگر صاحب کے ہاتھ میں جوتا تھا' اور شوکت صاحب بجائے سہمنے کے خوش تھے۔ اس وقت جگر صاحب بجائے شعروں کے فی البدیہہ نثر کہہ رہے تھے کہ "حیدرآباد دکن میں ان سے بہتر جوتے نہ مل سکے' یہ دو جوڑے لایا ہوں۔ ان میں سے ایک اپنی پسند کا رکھ لیں۔ دوسرا فلاں صاحب کو دینا ہے ان کی بھی فرمائش تھی' اور فلاں صاحب سے اِس جوتے کا ذکر نہ کرنا۔ ورنہ ان کی دل شکنی ہو گی۔ جُوتے خریدتے وقت اُن کا خیال ہی ذہن سے اُتر گیا۔"

ادھر شوکت صاحب کو دونوں جُوتے جی جان سے پسند تھے۔ شاید یہی سبب تھا کہ وہ دونوں جوتوں کی شان میں قصیدے پہ قصیدے کہہ رہے تھے۔ چند لمحے پہلے جگر صاحب جو اشعار گنگنا رہے تھے۔ اس کا مطلب کچھ ویسا ہی معلوم ہوا جیسے کسی فلم میں کوئی ہیرو یا ہیروئن کسی بات پر اچانک خوش ہو کر گانے لگے۔ جگر صاحب کے سلسلے میں ایسی تشبیہہ دینا گھٹیا سی بات ہے۔ ورنہ میں اصرار کرتا کہ میری اس تشبیہہ پہ سو فی صد نہ سہی' اسّی فی صد اعتبار کر لیجئے۔

میں آنکھیں ملتا ہُوا باہر آ ہی چکا تھا۔ اس لیے شوکت صاحب نے جگر صاحب کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ "آپ انھیں جانتے ہیں ؟"

"جی ہاں"

شوکت صاحب کو میرا صرف جی ہاں کہنا پسند نہ آیا۔ اس لیے انھوں نے بات بڑھائی۔ "بھلا کون ہیں ؟"

مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا کہ شوکت صاحب مجھ پر اور جگر صاحب پر یک وقت

کرم کرنا چاہتے ہیں۔ مجھ پر اس لیے کہ مجھ سے ایک بڑے شاعر کا تعارف کرایا جا رہا تھا اور جگر صاحب پر اس لیے کہ میرے منہ سے ان کی شان میں چند ایک مدحیہ فقرے کہلوا کر اپنی جگہ خوش ہو جائیں۔

ممکن ہے ان کے ذہن میں یہ بات ہو کہ ہر انسان خواہ وہ کتنا ہی وسیع الظرف کیوں نہ ہو۔ ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر تسکین پاتا اور خوش ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے جواباً گزارش کی کہ انھیں تو سب جانتے ہیں لیکن یہ سب کو نہیں جانتے۔"

اس پر جگر صاحب کے چہرے پر دبی دبی مسکراہٹ کھیل گئی اور شوکت صاحب سے میرے متعلق پوچھا۔ "آپ کی تعریف؟"

میں نے سوچا کہ میرا تعارف کوئی دوسرا کیوں کرائے۔ حالانکہ تعارف کسی دوسرے ہی نے کرایا تھا۔ پھر بھی اپنا بھرم یہ کہہ کر رکھ لینا چاہا کہ "میرا نام محمد طفیل ہے اور لاہور سے حاضر ہوا ہوں۔"

شوکت صاحب کسی بھی محفل میں بیٹھے ہوں۔ اُن کا خاموش رہنا ناممکن ہے۔ اس لیے وہ اپنی روایت غلط ہوتے نہ دیکھ سکے۔ یوں بھی جگر صاحب نے براہِ راست سوال بھی انہی سے کیا تھا۔ اس لیے ان کا کچھ نہ کچھ کہنا برحق تھا: "آپ لاہور سے آموں کے موسم میں تشریف لاتے ہیں۔ آم بھی کھاتے ہیں اور مجھ سے کتاب بھی لکھواتے ہیں۔"

جب شوکت صاحب کا "تعارفیہ" ختم ہوا تو جگر صاحب پہلے ہلکے سے مسکرائے، پھر کہا۔ "بڑی مسرت ہوئی۔" اور ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ "جو کوئی یہ کہتا ہے کہ میں "آمیہ" ہوں تو طبیعت باغ باغ ہو جاتی ہے۔

اس پر میں نے جھجکتے جھجکتے ایک ترمیم اس فقرے کے سلسلے میں پیش کردی اور عرض کیا "اگر اس فقرے کو یوں کہا جائے تو کیسا رہے کہ جو کوئی یہ کہتا ہے کہ میں آمیرہوں تو طبیعت آم آم ہو جاتی ہے۔"

اس پر محفل میں پھلجھڑی کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ جگرصاحب تو بے اختیار ہنسے دو مرتبہ خوب خوب بھی کہا۔ ہنسی پر ضبط کیا تو مجھ سے کہا۔

"کل میری اسٹیشنی خاں صاحب کے ہاں آموں کی دعوت ہے۔ مزے مزے کے آم ہوں گے۔ لہٰذا میرے ساتھ چلنا۔"

جگرصاحب کے ساتھ ایک اور صاحب بھی تھے۔ وہ بالکل خاموش ایسے جیسے انھوں نے ابھی تک بولنا نہیں سیکھا۔ میں نے اُن سے رسم و راہ پیدا کرنی چاہی اور عرض کیا "میرا تعارف تو ہوگیا۔ آپ کی تعریف؟"

انھوں نے بولتے ہوئے جواب دیا "مجھے مجروح سلطان پوری کہتے ہیں" میں نے اُن کا نام سُن رکھا تھا۔ اس لیے مجھے ان کی سنجیدگی بڑی پیاری معلوم ہوئی۔ ہم لوگ ایک دوسرے سے متعارف ہو کر سنبھلے ہی تھے۔ خیال تھا کہ اب ایک دوسرے کی خیر خیریت پوچھیں گے۔ ایک دوسرے کو باتوں سے تولیں گے کہ کون کتنے پانی میں ہے یا کون کتنے وزن میں ہے کہ اتنے میں جگرصاحب نے پوچھا:

"اب کیا وقت ہوگا؟"

شوکت صاحب نے جواب دیا کہ "دو بجنے والے ہیں" اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "آپ کی گھڑی شریف میں کیا بجا ہے؟"

جگرؔ صاحب کو ایک دم یاد آیا کہ گھڑی تو ان کے پاس بھی تھی اور ایسی گھڑی تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ دن بھی بتاتی تھی۔ اس لیے انھیں ہم سب کی طرف دیکھ کر مسکرانا پڑا۔ ہم ان کی اس بھول پر پوری طرح لطف اندوز بھی نہ ہوئے تھے کہ انھوں نے میرے نزدیک ایک عجیب سی بات کہہ دی۔ "اوہ! نمازِ جمعہ تو رہی جاتی ہے۔ اچھا بھئی چلیے۔"

میں نے سُن رکھا تھا کہ جگرؔ صاحب شراب پیتے ہیں۔ ایسے جیسے پانی، اور انھیں اپنے تن بدن کا ہوش نہیں ہوتا۔ اس وقت انھیں تن بدن کے علاوہ اللہ کی بارگاہ میں سجدہ ریزی بھی یاد تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے ایک اولوالعزم رند سے نمازِ جمعہ کی بات سن کر بڑا تعجب ہوا لیکن انھوں نے مجھے زیادہ متعجب ہونے کا موقع نہ دیا۔ بلکہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ساتھ ہی مجھ سے کہا۔ "آیئے آپ بھی چل کر نماز پڑھیں۔"

چنانچہ تینوں نمازی کڑکتی دھوپ میں اللہ کا نام لے کر نکل پڑے۔ شوکت صاحب کو نماز سے زیادہ ایک اور ضروری کام تھا۔ اس لیے وہ معذور رہے۔ مجروحؔ صاحب کی دو ایک باتوں سے یہ اندازہ ہوا کہ وہ نماز میں شرکت صرف جگرؔ صاحب کی وجہ سے کر رہے ہیں۔ اُدھر دیر بھی ہو گئی تھی۔ اس لیے جب راستے میں نوری ریسٹورنٹ آیا، تو جگرؔ صاحب بجائے مسجد میں جانے کے ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہو گئے۔

مجروحؔ صاحب ہنسے اور کہا۔ "جگرؔ صاحب یہ مسجد نہیں ہے۔ ریسٹورنٹ ہے۔"

جگرؔ صاحب نے کہا۔ "مجھے معلوم ہے۔ سوچا کہ وقت تنگ ہے۔ اللہ کو تو خوش کر نہیں سکتا۔ اُس کے بندوں ہی کو خوش کر دوں ——— آیئے!"

ان کے حکم کی تعمیل کی جب چائے سامنے آئی، تو جگرؔ صاحب نے خود ہی بنانی شروع کر دی، ورساتھ ہی کہنے لگے ۔۔۔ " جو دلی سکون اور راحت اللہ کی بارگاہ میں حاضری پر ہوتی۔ وہ افسوس کہ میری کاہلی سے نصیب نہ ہوئی۔ میں دو ماہ سے سفر میں تھا۔ اس عرصے میں کوئی نماز قضا نہ ہوئی، آج لکھنؤ پہنچ کر قضا ہوئی۔ نماز ہر انسان کو پڑھنی چاہیئے، خواہ وہ مسلمان ہو یا نہ ہو۔ اس لیے کہ اس سے انسان بڑا پاکیزہ نفس رہتا ہے۔ اگر انسان سے اس کی پاکیزگی اور طہارت چھن جائے تو وہ شیطان بن جاتا ہے ۔۔۔ بھئی چائے لونا بن گئی ہے ۔۔۔ جس نے خدا سے لَو لگائی۔ اُس نے سب کچھ پالیا۔ میں اپنے پیرومرشد کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُنھوں نے فرمایا کہ تزکیۂ نفس ہی سب سے بڑی عبادت ہے، وہ بڑی برگزیدہ اور باعمل شخصیت ہیں۔ اُن میں جمالی اور جلالی دونوں کیفیات ساتھ ساتھ ہیں۔ مولانا اشرف علی تھانوی بھی اُن کے مریدوں میں سے ہیں (اُن دِنوں مولانا اشرف علی تھانوی زندہ تھے) حضرت قاضی سید عبدالغنی شاہ صاحب کا نام تو آپ نے سُنا ہوگا ۔۔۔ بھئی شکر کم ہے، لڑکے کو آواز دینا ۔۔۔ حضرت عام پیروں فقیروں کی طرح نہیں ہیں۔ اُن کے مرید بڑی دور دور تک ہیں۔ اُن کی خدمت میں حاضر ہو کر آدمی اپنے آپ کو کونین کا مالک سمجھنے لگتا ہے ۔۔۔ بھئی چائے کا مزا نہیں آیا۔ نہ جانے کیا بات ہے "

یہ تھا میرا جگرؔ صاحب سے پہلا باقاعدہ تعارف!

سچ پوچھئے تو صحیح تعارف میرا اُن سے بہت پہلے امرتسر کے ایک مشاعرے کے سلسلے میں ہوا تھا۔ وار فنڈ کے سلسلے میں امرتسر میں بڑے وسیع پیمانے پر ایک

آل انڈیا مشاعرہ ہوا تھا۔ پاکستان اُن دنوں معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا، ورنہ میں انڈو پاک مشاعرہ کہتا۔

آج جب پاکستان بن چکا ہے تو امرتسر کتنی دور ہو گیا ہے۔ لندن اور امریکہ پہنچنا نسبتاً آسان ہے لیکن اُس امرتسر پہنچنا اب آسان نہیں رہا۔ جہاں ہم مشاعرے سُننے، کپڑا خریدنے، فالودہ اور لسّی پینے جایا کرتے تھے۔

ڈپٹی کمشنر امرتسر مشاعرے کے منتظم تھے۔ ہندوستان کے قریب قریب تمام شعرا وہاں موجود تھے سوائے سیماب اکبرآبادی کے جب میں اپنے ایک دوست سمیت امرتسر پہنچا تو ہم اتفاق سے منتظم بنا دیے گئے۔ تمام شعرا کا ایک ہوٹل میں قیام تھا، شعرا زیادہ تھے اور ہوٹل کے کمرے تھوڑے تھے۔ اس سلسلے یہ پایا کہ ایک کمرے میں جگرؔ مرادآبادی اور جوشؔ ملیح آبادی صاحب کو ٹھہرایا جائے اور باقی شعرا سے درخواست کی جائے کہ وہ ہوٹل کے لان میں جو خیمے نصب کئے گئے ہیں اُن میں قیام اور آرام فرمائیں۔

شدید سردیوں کا زمانہ تھا۔ شعرا حضرات کے دانت سے دانت بج رہے تھے۔ اگر اس وقت ان سے یہ درخواست کی جاتی کہ مشاعرہ شروع ہے، لہٰذا آپ اپنا اپنا کلام سنائیے تو منتظمین کی شان میں وہ وہ ہجویات پڑھی جاتیں کہ سوداؔ کی روح بھی تسکین پاتی۔

مجھے اس وقت دو ایک بزرگ قسم کے شعرا کا بڑا خیال آیا اور چاہتا تھا کہ انھیں کسی طرح سے ایک ہی کمرہ مل جائے۔ جب میں نے اس کا تذکرہ کچھ اور منتظمین سے کیا تو ڈانٹ پڑی۔ خبردار ایسی حرکت نہ کرنا۔ ورنہ مصیبت آجائے گی۔ میں مصیبتوں سے پہلے ہی گھبراتا ہوں۔ اس لئے چپکا ہو رہا۔ کہتے ہیں ساغرؔ نظامی صاحب رات کی گاڑی سے

تشریف لائے، تانگے سے اُن کا سامان اُترتے ہی ایک دم شور برپا ہوگیا کہ "ادھر لے آؤ۔ میرا سامان، میں ٹینٹ میں ہرگز نہ ٹھہروں گا۔" کسی نے کہہ دیا کہ کُل ایک کمرہ خالی تھا۔ اُس میں جگر صاحب اور جوش صاحب کو ٹھہرایا گیا ہے۔ اگر ایک بھی کمرہ خالی ہوتا تو آپ کو پیش کر دیا جاتا۔ مجبوری ہے۔

اس پر ساغر صاحب بگڑے اور کہنے لگے کہ "جب جگر اور جوش کو کمرے میں ٹھہرایا جا سکتا ہے تو مجھے کیوں نہیں ٹھہرایا جاتا"۔۔۔ صاحب انھوں نے خوب خوب ہنگامہ کیا۔ شعرا اپنے اپنے خیموں سے نکل آئے۔ جگر صاحب کے کانوں میں بھی بھنک پڑ گئی۔ کمرے سے اُٹھے۔ میدانِ کارزار تک آئے، اور ساغر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آپ خفا نہ ہوں۔ میرا کمرہ حاضر ہے، تشریف لائیے۔"

اس کے بعد جگر صاحب کمرے میں واپس آئے اور اپنا سامان اُٹھا کر خود ایک ٹینٹ میں چلے گئے۔ جب ہم لوگ ساغر صاحب سے اپنی مجبوریوں کا تذکرہ کر کے پلٹے تو دیکھا کہ جگر صاحب اپنے کمرے میں موجود نہیں۔ ایک صاحب سے معلوم ہوا کہ وہ کسی ایک خیمے میں چلے گئے ہیں۔ انھیں ڈھونڈھا گیا اور اُن سے درخواست کی کہ آپ کمرے میں واپس تشریف لے چلیں تو انھوں نے جانے سے قطعی انکار کر دیا۔ اور یہ کہہ کر انکار کیا کہ ۔۔۔ "مجھے اپنی راحت سے زیادہ دوسروں کی راحت سے خوشی ہوتی ہے۔"

یہ تھی میری جگر صاحب سے پہلی ذہنی ملاقات، اُس وقت کسی نے کہا "بڑے با اخلاق ہیں"۔ کسی نے کہا "یہ شاعر تھوڑی ہیں، بادشاہ ہیں۔"

قیامِ لکھنؤ میں میری جگر صاحب سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ بھوپال ہاؤس میں

ان کا قیام تھا۔ اُن دنوں وہ کوئی ہفتہ عشرہ لکھنؤ ٹھہرے ہوں گے۔ اگر ہفتہ عشرہ کا لفظ صرف دنوں سے مختص نہ ہوتا، تو میں عرض کرتا کہ اُن دنوں میری اور جگر صاحب کی ملاقاتوں کی تعداد کوئی ہفتہ عشرہ ہوگی۔ طویل ملاقاتیں رہیں۔ گونڈہ تک ان کے ہمراہ بھی گیا، ان کا گھر دیکھا جو کبھی اصغر گونڈوی کا مکان تھا۔ انھوں نے میری بڑی خاطر مدارات کی، بعد میں سُنا کہ جو کوئی ان کے گھر جا نکلے۔ اس کی جگر صاحب ایک نیاز مند کی حیثیت سے اتنی عزت کرتے ہیں کہ جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔

اِن دنوں جبکہ پاکستان میں گندم کی قلت ہے۔ اگر پاسپورٹ سسٹم نہ ہوتا تو میں جگر صاحب کے ہاں چلا جاتا۔ جگر صاحب پہ "کرم" بھی ہوتا اور میرا غذائی مسئلہ بھی حل ہو جاتا۔ مزے مزے کی چیزیں کھانے کو ملتیں، مزے مزے کے شعر سُنتا۔ واپسی پر جگر صاحب سے ایک بار پھر سُن لیتا کہ اُجاڑ بیابان میں رہتا ہوں، یہاں ٹھکانے کی کوئی چیز کھانے کو نہیں ملتی۔ اِس لیے معاف کرنا آپ کی کوئی خدمت نہ کر سکا۔

اُنہی دنوں جگر صاحب سے پوچھ ڈالا "قبلہ سنا تھا کہ آپ بلا کے پینے والے تھے۔ اب کیسے مسلمان ہو گئے؟"

"بس چھوڑ دی۔ جہاں تک میرے مسلمان ہونے کا تعلق ہے، اس کا حال خدا جانے۔"

میں نے تصدیق چاہی۔ "بالکل؟"

"جی ہاں، قطعی۔ جب میں نے شراب سے توبہ کی تو ربّ العزت سے اپنے ارادے کی استقامت کی دعا بھی مانگی ـــ شراب ترک کرنے کے بعد سخت بیمار ہو گیا تھا۔ زندہ بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ڈاکٹر اور احباب یہ کہتے تھے کہ اب انتقال ہوا کہ اب،

دل کے اوپر ایک بڑا خطرناک قسم کا پھوڑا نکل آیا تھا۔ ڈاکٹروں نے تشخیص کی کہ یک دم شراب چھوڑ دینے سے یہ بلا نازل ہوئی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ مشورہ دیا کہ اگر میں پھر شراب پینی شروع کر دوں تو وقت ٹل سکتا ہے۔ وہ وقت میرے امتحان کا تھا۔ میں نے ڈاکٹروں سے صاف کہہ دیا کہ مسلمان کی قسمت میں جب موت ایک ہی بار لکھی ہے تو پھر وہ کاہے سے شرمساری کیوں ہو ـــــ یہ قدرت کا اعجاز تھا کہ مجھے آرام آگیا یا میرے ارادے کی پختگی پر قدرت کو ترس آ گیا ہوگا۔"

ایک روایت ترکِ شراب کے سلسلے میں یہ بھی ہے کہ شراب ان کے اور ان کی بیوی کے درمیان حائل ہوئی اور لاٹھی مارے پانی جُدا نہ ہو سکا۔ پھر اسی شراب کے ترک نے اپنی ہی بیوی سے پھر ان کی شادی کرا دی۔

جس نے جگر صاحب کو رندی کے زمانے میں دیکھا بھالا ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ دُھت پیے ہوئے ہیں۔ تن بدن کا ہوش نہیں لیکن تکلّم کی نوبت جب بھی آئی، تو انھوں نے مذہب، اخلاق اور شرافتِ نفس ہی کے تذکرے چھیڑے۔ آج جب دُخترِ رز کو چھوڑے عرصہ گزر چکا ہے تو ان کی زبان پر وہی مذہب، وہی اخلاق اور وہی شرافتِ نفس کی باتیں ہیں۔ سُنا ہے کہ ہر رندی کر باطن کی باتیں اُگلتا ہے تو سوچتا ہوں کہ جگر صاحب کے زمانۂ رندی اور اس وقت کی باتوں میں کتنی مطابقت ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ آج جگر صاحب نہ پیتے ہوئے بھی پیے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ باتیں وہی ہیں، کھوئے کھوئے بھی ہیں، آنکھوں میں نشہ بھی ہے۔ وجہ معلوم؟

ــــ شب بیداریاں!

قیامِ پاکستان کے بعد مسلمانوں پر ہندوستان میں اور غیر مسلموں پر پاکستان میں جو کچھ گزری، وہ بربریت کی عجیب داستان ہے۔ انسان اشرف المخلوقات ہوتے ہوئے بھی کتنا ذلیل ہے۔ اس کا حال کسی نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ کسی نے اپنی جان نچھاور کر کے ظالم کے چہرے پر اپنے خون کی سیاہی مل دی۔

مورخ جب اس دور کی تاریخ لکھے گا، تو ہند و پاک کا سر اور بلند ہو جائے گا۔
۱۹۴۷ء کے فوراً بعد ہندوستان میں ٹکنا آسان نہیں رہا۔ لاکھوں کی تعداد میں مسلمان پاکستان آ رہے تھے، ان میں زیادہ تر نادار اور بے بس تھے جو مرے ہوئے تھے، نہ ہی امن تھے، نہ ہی عصمت تھے۔ انہی دنوں میں نے بھی جگر صاحب کو ایک خط لکھا کہ موجودہ حالات میں بہتر یہی ہے کہ آپ بھی پاکستان آ جائیں۔ ان کا جواب آیا:

عزیزِ گرامی قدر! سلام مسنون

آپ کا گرامی نامہ ملا۔ آپ کا خیال درست ہے کہ بظاہر مسلمانوں کا ہندوستان میں رہنا مشکل نظر آتا ہے۔ میں اگر پاکستان آنا چاہوں تو میرے لیے بڑی آسانیاں بھی ہیں۔ لیکن جب میں بھی احباب کی طرح سوچتا ہوں تو میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا ہے، وہ صرف اس لیے کہ اگر ہم صاحب ثروت مسلمان پاکستان چلے گئے تو ان تمام بے سہارا مسلمانوں کا کیا ہوگا جو صرف خدا کی ذات پر بھروسہ کیے بیٹھے ہیں جن کے پاس نہ تن ڈھکنے کو کپڑا ہے نہ ایک وقت کی روٹی۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ جیوں گا تو ہندوستان

ہیں اور مروں گا تو ہندوستان میں۔"

جگر صاحب کا جب یہ جواب آیا تو بڑی ڈھارس ہوئی۔ اس لیے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کا ایمان اور اخلاق ترازو میں تُل رہا تھا۔ کئی ایک لیڈر قسم کے مسلمان وہاں سے یوں بھاگے جیسے اس لمحے کا انتظار ہی تھا۔ انھوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اُن مسلمانوں کا کیا حشر ہوگا جن سے ہم نے پاکستان کہا اور انھوں نے زندہ باد کے نعرے لگائے تھے۔ ایسے نازک وقت میں جگر صاحب کا یہ کہنا کہ "جیوں گا تو ہندوستان میں اور مروں گا تو ہندوستان میں" اُس وقت کے کئی صاحبِ مسلمانوں کے لیے ان کا یہ جواب بڑا شرم آموز تھا۔

پہلے مشاعرے نہ جانے کس مقصد کے تحت ہوتے تھے۔ اب زیادہ تر مشاعرے اس لیے ہوتے ہیں کہ جگر صاحب کا کلام سنا جائے۔ میرے خیال میں اب مشاعرہ اور جگر مرادآبادی ایک ہی شاعرے کے دو نام ہیں۔ یہ کوئی خوشی کی بات نہیں اس لیے کہ سب کے سب سامعین اتنے خوش مذاق نہیں کہ وہ اچھے شعر اُن کے کلام کے مشتاق ہوں۔ زیادہ تر ایسے ہیں جو مشاعرے کو ایک تفریحی مشغلہ سمجھ کر شرکت کرتے ہیں۔ جگر صاحب کی بدقسمتی یہ ہے کہ انھیں جینے کی خاطر مشاعروں میں شرکت کرنی پڑتی ہے۔

اس وقت میرا یہ موضوع نہیں ہے کہ میں جگر صاحب کے فن پر کچھ عرض کروں پھر بھی یہ کہنے دیجیے کہ جگر صاحب کے شاعری کارنامے اہم ہیں۔ جگر صاحب نے خود اپنے ہاتھ سے شعری ادب کی تاریخ میں اپنا نام جلی حروف سے لکھ دیا ہے

اور یہ کسی کے مٹائے مٹنے والا نہیں۔

پنجاب نے اُردو ادب کی بڑی خدمات سرانجام دی ہیں۔اس پر اہلِ پنجاب کو فخر بھی ہونا چاہیے۔اچھے ادیبوں اور شاعروں کی پنجاب نے ہمیشہ قدر کی اور انھیں ہمیشہ سرآنکھوں پر بٹھایا۔لیکن نہ جانے کیا بات ہوئی کہ ایک بار پنجاب کا پریس جگر صاحب کے خلاف حرکت میں آگیا۔وہ پنجاب جو اپنی مہمان نوازی اور کشادہ دلی کے لیے مشہور رہا ہے، اپنی روایات بھول گیا۔ایک اخبار نے لکھا:

> "ایک زمانہ تھا کہ مرادآباد کے لوٹے بہت مشہور تھے۔تقسیم کے بعد لوٹے عنقا ہو گئے۔لیکن اس کی جگہ شاعروں نے لی ہے۔اب مرادآباد میں شاعر ڈھلتے ہیں اور کچی پکی ڈھلائی کے بعد پاکستان بھیج دیے جاتے ہیں۔
>
> جگر مرادآبادی کوئی غیر معمولی نوعیت کا شاعر بھی نہیں۔ایک اوسط درجے کا سخن گو ہے جس کی شاعری وقت کے تقاضوں سے ہمیشہ معرا رہی ہے۔اگر ہوشمندی کے ساتھ جگر صاحب کی غزل کا مطالعہ کیا جائے تو بڑی آسانی سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے کہ اس کے کلام میں جا بجا فصاحت کا خون کیا گیا ہے (جگر کی) قدرت نے گلا اچھا عطا کیا ہے جس کے باعث ہر قسم کی حماقت اور ترہات پر شعر کا گمان ہوتا ہے۔"

واضح ہو کہ میں خود پنجابی ہوں اور مجھے اپنے پنجابی ہونے پر فخر

لیکن جب میں نے اس انداز کی تنقید پڑھی تو بحیثیت ایک پنجابی کے میری گردن مارے
شرم کے جھک گئی۔

عین ممکن ہے کہ جگر صاحب نے یا ان کے کسی دوست نے اہلِ پنجاب کو کسی جائز
شکایت کا موقع دے دیا ہو۔ پھر بھی یہ باتیں ہمیں نہیں جچتیں۔ آپ کو معلوم ہے، ان
ساری باتوں پر جگر صاحب نے لاہور سے جاتے ہوئے کیا کہا تھا؟ "میں نے
یہاں آکر ناحق اہلِ پنجاب کے دلوں کو ٹھیس پہنچائی۔ دوستو اب میری اس خطا کو
معاف کر دینا۔"

جگر صاحب کا خیال ہے کہ حقیقی شاعر کی تخلیقات اس کے اپنے جذبات و
احساسات کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ اچھا انسان ہی اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ اگر کوئی بُرا
انسان اچھے شعر کہہ بھی لے، تو اس کے اشعار اثر سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ میں
یہاں اس بحث میں نہ پڑوں گا کہ اچھے شعر کہنے کے لیے اچھا انسان بنئے۔ ویسے اچھا
انسان بننا کوئی بُری بات بھی نہیں۔ میں نے کئی اچھے آدمیوں کو دیکھا ہے کہ وہ اچھے
شعر نہیں کہہ پاتے۔ برخلاف اس کے واجبی قسم کے بُرے انسانوں کو اچھے شعر کہتے
سُنا ہے۔ میں اس بحث کو یہیں ختم کرتا ہوں، ورنہ میرے ہی کئی دوست مجھ سے ناراض
ہو جائیں گے۔

ہاں تو جگر صاحب یہ کہتے ہیں کہ اچھا انسان ہی اچھے شعر کہہ سکتا ہے۔ یہ بات
کسی اور کے لیے صحیح ہو یا نہ ہو، جگر صاحب کے سلسلے میں غلط نہیں کہ سچے شاعر کا
ماحول سے متاثر ہونا لازمی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد جو دونوں طرف ہولناک حالات

پیدا ہوئے ان سے جگرؔ صاحب بُری طرح متاثر ہوئے۔ میرا خیال ہے کہ ان حالات سے متاثر ہوکر جتنی اثر انگیز چیزیں انھوں نے کہی ہیں کسی اور شاعر نے نہیں کہیں۔ کسی نے دو ایک چیزیں کہیں اور خاموش، لیکن جگرؔ صاحب نے اس المیے کے مسلسل نوحے کہے ہیں۔ طوالت کے ڈر سے ان کی غزلوں کے اس نوع کے اشعار نہیں پیش کرتا۔ اگر ان کی شخصیت کے ایک نمایاں رُخ کو ایسے واقعات واضح نہ کرتے ہوتے تو شاید میں اس بات ہی کو ٹال جاتا۔ اُن حالات میں ڈوب کر جو کچھ انھوں نے کہا، اُن میں سے ؎

فکرِ جمیل خوابِ پریشاں ہے آج کل
شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل

یہ غزل اسی ہولناک پس منظر کو واضح کرتی ہے۔ لیکن یہاں حالات سے مایوس نظر نہیں آتے۔ ان کا ایمان ہے کہ مایوسی کفر ہے ؎

یہ لالہ و گل یہ صحن و روش ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیرِ گلستاں ہوتے ہیں

اسی غزل میں ایک اور شعر ہے ؎

یہ خون ہے جو مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرفِ بہاراں ہوتے ہیں

غرض اس دور کی ہر غزل میں کئی اشعار آپ کو ایسے ملیں گے جن میں درد ہے کسک ہے تپش ہے۔ چونکہ یہ میرا موضوع نہیں اس لیے میں چھان پھٹک کی بجائے صرف اشارے کرتے ہوئے چلتا ہوں۔ اہلِ ہند کو مخاطب کرتے ہوئے انھوں نے ایک

گیت بھی لکھا تھا جس پر وہاں بڑی لے دے ہوئی۔ بعض اخبارات نے حکومت کو مشورہ دیا کہ انھیں گرفتار کرلیا جائے۔ وہ گیت تھا۔

بھاگ مسافر، میرے وطن سے، میرے چمن سے بھاگ
اُوپر، اُوپر، پھول کھلے ہیں، بھیتر بھیتر آگ

غرض جو ان کے دل پر گزرتی ہے، رقم کر دیتے ہیں۔ نتائج کی پروا نہ انھیں تھی ہے اور نہ ہوگی۔ انگریزوں کے زمانے میں جب بنگال میں قحط پڑا تو انھوں نے اُن دنوں بھی ایک آتشیں غزل کہہ ڈالی ؎

بنگال کی میں شام و سحر دیکھ رہا ہوں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں

اس پر بھی بڑی چہ میگوئیاں ہوئی تھیں کہ انھیں گرفتار کرلیا جائے۔ حیرت ہے کہ ایک غزل گو شاعر جسے حسن و عشق کے معاملات سلجھانے اور اُلجھانے ہی سے فرصت نہیں ہوتی۔ وہ بھی حالات سے اتنا متاثر ہوتا ہے کہ رومانی وادیوں سے نکلتا ہے اور حاکمانِ وقت کے منہ پر طمانچے دے مارتا ہے۔

جگر صاحب کی سوچ اور اس کے اظہار اور عمل میں تضاد نہیں۔ کھوج لگانے سے کوئی نہ کوئی کمزوری ان میں مل ہی جائے گی۔ میں بھی نہیں چاہتا کہ ہم اچھے بھلے انسان کو فرشتہ کہہ کر اس کی تذلیل کریں۔ لیکن کھوج لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ اگر کھوج لگانا ہی ہے تو متقابلتاً کھوج لگائیے، اور پھر دیکھیے کہ جگر صاحب کتنے اُونچے مقام پر ہیں۔ آج سوچتا ہوں کہ ۱۹۳۲ء میں جگر صاحب نے جو خط مجھے لکھا تھا اُس میں

اور ان کے اِس دَور کے کلام میں کتنی مطابقت ہے۔

جگر صاحب یہ بھی کہتے ہیں کہ کوئی عورت اچھے شعر نہیں کہہ سکتی۔ وہ اسے غیر قدرتی بات سمجھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ عورت کی تخلیق اس کی مقتضی ہے کہ اس پر شعر کہے جائیں۔ اس کے حسن و جمال کو سراہا جائے۔ اس کی نزاکت اور اس کی تمام نسائی خصوصیات کے ساتھ ساتھ قدرت کی اعجاز کاریوں کی داد دی جائے۔ لیکن عورت خود شعر کہنے چل نکلی ہے۔ تعجب!

وہ جب حسن و محبت کی باتیں کرتی ہے تو بڑی عجیب لگتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے جھوٹ بول رہی ہو۔ عورت شعر کے معاملے میں جھوٹ بولے نہ بولے اتنا تو شدید احساس ہوتا ہے کہ اس نے کسی شاعر کا حق مارا ہے۔ جب کوئی عورت اپنے شعروں میں اپنے محبوب کا تذکرہ کرتی ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس نے اپنے آپ کو گالی دی ہے۔ وہ جب محبوب کی بے وفائیوں کے تذکرے کرتی ہے تو معاً یہ بات ذہن میں آتی ہے کہ محبوبیت عمل میں آکر جتنے فریب ایک عورت نے دیئے ہیں وہ مردوں نے ان بیچاریوں کو کہاں دیئے ہوں گے پھر وہ اپنے اشعار میں رقیبوں کا بھی ذکر فرماتی ہیں۔ نہ جانے ان کے رقیب مرد ہیں یا عورتیں۔ کئی ایک اور وجوہ بھی ہیں جن کی بنا پر یہ کہتا ہوں کہ عورت شعر کہلوائے کہے نہیں۔ تماشہ بنائے، بنے نہیں۔

جگر صاحب بڑے خوش مذاق ہیں۔ ہر وقت بقراط بنے نہیں بیٹھے رہتے۔ دوستوں کو دیکھ کر کھل اور کھُل جاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں کوئی نہ کوئی فقرہ چپکا دیں گے، پھر کھلکھلا کر ہنسیں گے۔ پھر ذرا سی ہنسی کو روکیں گے اور "داد" کہہ کر پھر ہنسیں گے اور

خوب جھینیں گے۔ ایک محفل میں جگرؔ صاحب شعر سُنا رہے تھے اور ایک صاحب بے نیاز سے بیٹھے تھے۔ ایک شعر پر انھوں نے ایکا ایکی اور بیساختہ داد دے ڈالی۔ جگرؔ صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا:

"آپ کے پاس قلم ہے؟"

"کیا کیجیے گا؟"

"میرے اس شعر میں ضرور کوئی خرابی ہے، ورنہ آپ داد نہ دیتے۔ اس لیے اسے اپنے دیوان سے خارج کرنا چاہتا ہوں۔"

اِسی طرح ایک اور صاحب نے ان سے کہا کہ "جگرؔ صاحب ایک محفل میں مَیں آپ کے ایک شعر پر پٹتے پٹتے بچا ہوں۔" اس پر جگرؔ صاحب نے کہا۔ "میرا وہ شعر تاثر کے اعتبار سے قطعی عاری ہوگا، ورنہ آپ ضرور پٹتے۔"

اگر جگرؔ صاحب یہ کہہ دیں کہ مجھے آپ کا مطلق اعتبار نہیں، تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ انھیں واقعی آپ پر مطلق اعتبار نہیں۔ اگر وہ یہ فرماتے ہوں کہ آپ نے انھیں دھوکا دیا ہے۔ پھر بھی اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے واقعی ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ بعض اوقات وہ اتنی سخت بات اپنے کسی قریبی دوست سے کہدیں گے کہ وہ بے چارا ہکا بکا رہ جائے گا۔ نتیجۃً وہ صاحب ملنا جلنا ترک کر دیں گے تو انھیں سوچ دامن گیر ہوگی۔ حاضرین سے کہتے رہیں گے کہ دیکھئے فلاں صاحب نے اب ملنا جلنا چھوڑ دیا ہے۔ ایک تو ستائیں اُوپر سے اکڑیں بھی۔ میں نے دو ایک کھری کھری باتیں کہہ دی تھیں، غصّہ آیا ہوگا۔ اِدھر یہ باتیں کہتے رہیں گے، اُدھر دل میں افسوس کرتے

رہیں گے کہ جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہوا۔ یہ تو نہ ہونا کہ وہ صاحب ملنا جُلنا چھوڑ دیتے۔ احباب سے کہیں گے فلاں صاحب سے ملاقات ہو تو اُن سے کہنا کہ جگرؔ صاحب یاد کرتے تھے۔

اگر وہ صاحب یاد پر بھی نہ آئیں تو جگرؔ صاحب بے چین رہیں گے۔ پھر خود اُن کے پاس پہنچ جائیں گے اور کہیں گے "آپ سے تو کئی دن سے ملاقات ہی نہیں ہوئی"! ظاہر ہے کہ وہ صاحب یہ تو نہیں کہیں گے کہ اب بھی میرے ملنے کی ضرورت باقی تھی۔ اس ساری کہانی میں جگرؔ صاحب کا کم اور ان کے دوستوں کا زیادہ ہاتھ ہوتا ہے۔ ان کا کوئی فیصلہ اپنا فیصلہ نہیں ہوتا۔ آپ جگرؔ صاحب کے لاکھ دوست سہی لیکن آپ کے متعلق ان کی رائے کسی وقت بھی تبدیل کرائی جا سکتی ہے۔

یوں بھی اس دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان کو قدم قدم پر فریب دیتا ہے، لیکن جگرؔ صاحب کے "دوستوں" نے اپنی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے خود انھیں جگہ جگہ فریب دیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ اب ان کے لیے دوست اور دشمن میں تمیز کرنا مشکل ہو گیا ہے

ان کے "دوست" انھیں عجیب و غریب مشورہ دیں گے: "جگرؔ صاحب اس بات کی حامی نہ بھر لیجیے گا، وہ صاحب تعلقات کی بنا پر آپ کی ذات سے ناجائز فائدہ اُٹھانا چاہتے ہیں۔ آپ کو رسوا کرانا چاہتے ہیں۔ پھر وہ صاحب بڑے بدنام قسم کے ہیں (خواہ اس بیچارے کی خصوصیت صرف اس کی نیک نامی ہی کیوں نہ ہو) فلاں صاحب بھی اُن کے متعلق یہی باتیں کر رہے تھے کہ انھوں نے فلاں صاحب کو دھوکا دیا۔" ایک آدھ بات خود اپنی طرف سے فی البدیہہ گھڑ دیں گے کہ میرے ساتھ یہ کیا ——

اُدھر جگر صاحب فرمائیں گے "ہاں صاحب وہ شخص تو اپنی صورت سے بدمعاش معلوم ہوتا ہے"۔ آپ خود ہی بتائیں اس میں جگر صاحب کا کتنا اور جگر صاحب کے دوستوں کا کتنا قصور ہے۔

جگر صاحب روز بروز فلسفی اور "ولی اللہ" بنتے جا رہے ہیں۔ ہر بات کو فلسفیانہ رنگ میں سوچیں گے، مذہبی رنگ میں اس پر تبصرہ کریں گے۔ یہ فتویٰ علماء سے لیجئے کہ مذہب اور فلسفے کا کہاں تک نبھاہ ہو سکتا ہے۔ مجھے تو گزارش یہ کرنا ہے کہ جگر صاحب اپنی باتوں میں بعض اوقات ایسے ڈوب جاتے ہیں کہ دوسرے کے پلے کچھ نہیں پڑتا۔ اگر دوسرے کے پلے کچھ پڑ گیا تو مزا آ گیا۔ ان کی باتیں غزل کے شعر ہوتی ہیں۔ جس طرح غزل کے شعر اپنے مفہوم کے اعتبار سے علیحدہ علیحدہ حیثیت رکھتے ہیں اسی طرح جگر صاحب کی باتوں کا مسئلہ ہے۔ ہر فقرہ (اگر سمجھا جا سکے) اپنی جگہ مکمل، لیکن ایک فقرے کا تعلق دوسرے فقرے سے ذرا کم ہوتا ہے۔ جگر صاحب غزلِ مسلسل کے ذرا کم قائل ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی باتوں میں غزلِ مسلسل والی کیفیت پیدا نہیں ہوتی۔ اگر کسی نوجوان نے جگر صاحب کی بات پر اعتراض کر دیا تو وہ پیار کے ساتھ جوش میں آ جائیں گے اور کہیں گے "یہ نازک سا مسئلہ آپ کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ آپ تو نئی تعلیم کے کرم خوردہ ہیں"۔

گفتگو میں اضافتوں کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں، جس سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ باتیں کسی پڑھے لکھے انسان سے ہو رہی ہیں لیکن ان میں روانی مفقود ہوتی ہے۔ پھر باتوں ہی باتوں میں کہیں کے کہیں نکل جائیں گے اور سامع بیچارہ وہیں کا وہیں بیٹھا

رہ جائے گا۔ کوشش کریں گے کہ اسے اس دنیا کی بھی سیر کرا دیں اور اُس دنیا کی بھی
ان کی باتیں عموماً اس قسم کی ہوتی ہیں:

" اگر میں آپ کے کہنے کے مطابق یہ مان لوں اور مجھے اس کا بھی یقین کامل ہو جائے کہ فلاں صاحب اچھے شعر کہتے ہیں۔ پھر بھی یہ کہوں گا کہ بس اُن میں وہی ایک چیز نہیں، اور وہ چیز پیدا تو ہوتی نہیں، وہ تو انسانِ کامل اور مردِ خود آگاہ میں خود بخود ہوتی ہے۔ میری مراد خلوص باصفا سے ہے۔ وہ شعر بڑے بداعمال ہوتے ہیں جو ایسے ایسے ذہنی نابالغوں پر وارد ہو جاتے ہیں اور دوسروں کے لیے وہ شعر مصیبت بن جاتے ہیں۔ جس شخص میں خلوص نہیں وہ پُرخلوص شعر کہہ نہیں سکتا۔ پُرخلوص شعر کہنے کے لیے فکر و نظر کی وسعت، بلند کرداری، مشاہدات و تجربات کی ضرورت ہے۔ اس کا فقدان عام ہے۔ جہل اور علم میں لوگ تمیز نہیں کر پاتے۔ پھر شعری دیانت کہاں ہے۔ اگر آپ اس چیز کو ویسے ہی کہتے چلے جائیں گے، تو آپ کو سینکڑوں سجدے بیکار نظر آئیں گے۔ ایک گنہگار کی آنکھوں میں انفعال کی جو چمک ایک بار پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں سجدوں کی کیا حقیقت ہے۔ میں اپنی رندی اور اپنی توبہ، دونوں زمانوں کے ذکر سے گھبراتا ہوں مجھے ذہنی اور روحانی اذیت اور کرب سا محسوس ہوتا ہے اور یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے۔ جی ہاں، جی ہاں وہی ہے جو آپ سمجھ رہے ہیں۔ اور صاحب یہ بہروپیہ پن تو میری سمجھ میں آ نہیں سکتا کہ انسان کی زندگی کچھ ہو اور شعر کے اسٹیج پر ایکٹر کی حیثیت سے آئے۔ صاحب یہ سب ایکٹر ہیں۔ یہ مینا کاری کرتے ہیں۔ یہ شاعری سے زیادہ کاریگری ہے۔ ایسوں کو شعر کا صحیح عرفان ہو ہی نہیں سکتا۔ صاحب مذہب

کیا ہے ؟ ذاتی وجدان، اگر وجدان بھی ہم نے مغرب سے مستعار لے لیا تو ہم کیا ہیں ؟ ہماری روایات کیا ہیں۔ لاحول ولا قوۃ۔"

پہلے جگرؔ صاحب بے انتہا شراب پیتے تھے، وہ چھوڑ دی۔ پھر بے انتہا سگرٹ پینے لگے، وہ چھوڑے۔ آج کل بے انتہا تاش کھیلتے ہیں، وہ بھی چھوڑ دیں گے۔ بہت ممکن ہے کہ چھوڑ بھی دی ہو۔ اس لیے کہ یہ ارادے کے بڑے پکے ہیں۔ اس سلسلے میں ان پر بڑا رشک آتا ہے کہ ارادوں میں پختگی ہو تو ایسی۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات آپ کو سناتا ہوں بشرطیکہ آپ جگرؔ صاحب سے نہ کہیں، ورنہ وہ کہیں گے دیکھو بھئی مفیقؔ یہ بات اچھی نہیں۔

اپنے ایک "تاشیئے" دوست سے جگرؔ صاحب ایک بار کہہ رہے تھے :-

"بھئی تاش سے میں نے توبہ کر لی ہے۔ نہیں نہیں اب نہ کھیلوں گا کہہ جو دیا اب نہ کھیلوں گا۔ کل فلاں صاحب آئے تھے اور میں تاش میں اتنا منہمک تھا کہ اُن سے کوئی بات ٹھیک سے نہ کر سکا۔ نمازیں قضا ہوئیں وہ الگ۔ بھلا یہ بھی کوئی معقولیت ہے کہ انسان صبح کا بیٹھا شام کر دے اور شام کا بیٹھا صبح کر دے۔"

وہ صاحب پوچھیں گے "آخر بات کیا ہوئی ؟"

جگرؔ صاحب جواب میں فرمائیں گے "کل رات خواب میں دیکھا کہ تاش کھیل رہا ہوں، فوراً بیدار ہوا اور لاحول پڑھی۔ پھر جو سویا تو وہی تاش کے باون پتے خواب میں۔ پھر لاحول پڑھی اور سوچتا رہا کہ اگر اسی حالت میں میرا انتقال ہو جاتا تو خدا کو کیا منہ دکھاتا۔"

ان کے دوستوں کو علم ہے کہ جگر صاحب کو باتوں سے رام نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ ایک چال یہ چل دیں گے کہ سامنے بیٹھ کر تاش کھیلنی شروع کر دیں گے اور کہیں گے کہ بھئی جگر صاحب نے چھوڑ دی۔ اب جگر صاحب بے چین کمرے کے چکر پہ چکر لگا رہے ہیں۔ پہلے آہستہ آہستہ پھر تیز تیز قدم اٹھائیں گے۔ اپنے لمبے بالوں کو ٹوپی کے نیچے کریں گے۔ اگر سر پہ ٹوپی نہ ہو گی تو بالوں کو اور پریشان کر دیں گے۔ پھر ایک آدھ بار آ کر چال دیکھ جائیں گے۔ تھوڑی دیر بعد کھیلنے والے کے ہاتھ سے پتے لے کر چال چل دیں گے۔ بس خود جم جائیں گے۔ ادھر دوست اپنی کامیابی پر مسکرائیں گے۔ ادھر یہ کہیں گے کہ میں بالکل نہ کھیلوں گا۔ یہ چال لگا رہے تھے، اس لیے میں نے ان کے پتے چھین لیے ہیں۔ اس طرح رات کے پیچھے صبح کر دیں گے اور بگڑی چال بناتے رہیں گے۔ یہ اپنے پارٹنروں کے پتے بھی دیکھتے جائیں گے اور جب اُن کے پارٹنر بھی ان کی تقلید کریں گے تو فرمائیں گے "یہ کیا واہیات حرکت ہے؟"

کھیلتے میں اگر ان کا کوئی دوست آ گیا اور اُس نے سلام کیا تو آپ کی نظر پتوں پر ہو گی اور وعلیکم السلام کو بہت لمبا کر کے جواب دیں گے۔ تھوڑی دیر بعد آنے والے کی صورت دیکھیں گے۔ پھر پوچھیں گے "مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟" پھر کھیل شروع، آدھ پون گھنٹے کے بعد اُن صاحب کی موجودگی یاد آئے گی تو پھر پوچھیں گے۔ "مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟" اگر رات بھر آپ اُن کے پاس بیٹھے رہیں تو وہ یہی پوچھتے رہیں گے "مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟"

مجھے معلوم نہیں کہ جگر صاحب قوالی کے شوقین ہیں یا نہیں۔ اس لیے کہ اس کا کوئی

تذکرہ میرے سامنے کبھی نہیں آیا۔ البتہ اس ضمن میں ایک قصہ ایسا ہے۔ وہ اگر غرض
کہ دول تو شاید ان کے اس ذوق کے سلسلے میں کوئی بات سپلے پڑے۔
پیر الٰہی بخش کالونی (کراچی) میں جگر صاحب کے ایک دوست (محمود علی خاں جامعی)
نے ان کی دعوت کی۔ میری بھی ان کی وجہ سے اُن سے سلام دعا تھی اس لیے میں بھی
مدعو تھا۔ رات کے گیارہ بجے جب دعوت سے فارغ ہو کر چلے تو راستے میں ایک
جگہ قوالی ہو رہی تھی۔ جگر صاحب نے فرمایا "بھئی قوالی۔"
"جی ہاں قوالی۔"
"چلو آؤ۔ ذرا سی قوالی ہو جائے۔"
میں اس فقرے پر حیران رہ گیا۔ اس لیے کہ نہ میں قوال تھا اور نہ ہی کسی قوال
کا دوست یہی وجہ تھی کہ مجھے اُن سے پوچھنا پڑا۔ "کیا فرمایا آپ نے؟"
"بھئی فرما یہ رہا ہوں کہ ذرا قوالی سن آئیں۔"
اس فقرے پر ذرا جان میں جان آئی اور یہ کہہ کر اُن کے ساتھ ہو لیا کہ دیر ہو رہی
ہے۔ منڈی آ رہی ہے اور پھر جہاں ہم جا رہے ہیں۔ وہ لوگ نہ جانے کون ہیں کیسے ہیں؟"
اس پر انھوں نے کہا "اگر انھوں نے پہچان لیا تو پھر گھبرانے کی بات نہیں۔ نہ
پہچانا تو ذرا دیر قوالی سن کر چلے آئیں گے۔"
ہم پہنچے تو بزم کی بزم استقبال کے لیے اُٹھی۔ ظاہر ہے کہ استقبال جگر صاحب
کا ہوا لیکن میں خوش ہو گیا۔ اس لیے کہ لوگ مجھ سے بھی بڑے احترام کے ساتھ
جُھک جُھک کر مصافحہ کر رہے تھے اور پوچھتے تھے۔ "مزاج اچھے ہیں۔"

قوالوں نے پہلے تو دو تین نعتیں پڑھیں۔ پھر جگرؔ صاحب کی غزلوں پہ غزلیں، اِدھر جگرؔ صاحب بھی روپے پہ روپے دے رہے تھے۔ قوال بھی خوش، جگرؔ صاحب بھی خوش، البتّہ میں ذرا سا افسردہ تھا۔ اس لیے کہ شرما شرمی میں مجھے بھی کچھ نہ کچھ دینا پڑ رہا تھا، اور قوال میری غزلیں نہیں گا رہے تھے۔

جگرؔ صاحب جہاں اور جس شہر میں جاتے گئے، واپسی پہ وہاں سے اپنی بیگم کے لیے عمدہ عمدہ ساڑیاں اور کپڑے خریدیں گے۔ انھوں نے میرے سامنے اپنی بیگم کے لیے اتنا کپڑا خریدا ہے کہ کئی بار مجھے یہ خیال ہوا کہ کہیں جگرؔ صاحب کی گونڈہ میں کپڑے کی دکان تو نہیں۔ لیکن میں گونڈہ پہنچ کر اس کی تصدیق کر چکا ہوں کہ ان کی گونڈہ میں کپڑے کی کوئی دکان نہیں۔ اور وہ جتنا کپڑا خریدتے ہیں بیگم ہی کے لیے خریدتے ہیں۔

ایک بار میں نے ان سے کہا کہ "آپ اتنے زیادہ اور اتنے قیمتی کپڑے کیوں خریدتے ہیں؟"

کہنے لگے "زمانۂ رندی میں مجھ سے بیگم کے سلسلے میں کچھ زیادتیاں سرزد ہو گئی تھیں، اُس کی تلافی چاہتا ہوں۔"

انھیں اس بات کا بڑا صدمہ ہے کہ لوگ ان کی دعوتیں کرتے ہیں اور پھر قیمت وصول کرنے کے لیے ان سے شعروں کی فرمائش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں جگرؔ صاحب کا ایک فقرہ خوب ہے "میں کھانے کو تھوڑی کھاؤں گا۔ بلکہ کھانا مجھے کھائے گا۔" جگرؔ صاحب سے اگر ان کے کسی ملنے والے

نے زیادتی کر دی، تو وہ یہ کہتے ہیں کہ "فلاں صاحب بک گئے" ان کی قیمت اتنے روپے ہے، سودا سستا رہا"

اگر ان کی کوئی چیز چوری ہو جائے تو یہ کہتے ہیں کہ "اگر چور صاحب مجھ سے پوچھ لیتے کہ جگر صاحب مجھے آپ کی فلاں چیز کی ضرورت ہے، تو میں چور صاحب سے کہتا کہ لے جاؤ"۔

ایک بار ان کی بیاض گم ہو گئی۔ بڑے پریشان ہوئے۔ ہر آنے جانے والے سے کہتے رہے کہ اگر میری بیاض چرانے والا مجھ سے کہتا کہ میں آپ کی بیاض چوری کرنی چاہتا ہوں تو میں اس سے کہتا کہ چوری کر لو۔ مگر میں نے جو دو ایک نئی غزلیں کہی ہیں وہ مجھے نقل کر کے دیتے جاؤ۔

جگر صاحب اوّل تو بہت کم لوگوں کو خط لکھتے ہیں جنھیں لکھتے ہیں اُن میں سے ہر ایک کے خط کا مضمون قریب قریب یکساں ہوتا ہے۔ وہی خلوص، وہی محبت، وہی یگانگی —— ہر ایک سے ایک سطح پر ملیں گے۔ خواہ کوئی گورنر جنرل ہو، خواہ معمولی کلرک، یہ بات ہر ایک میں کہاں ——

مشرقیت ان کی رگ و پے میں موجزن ہے۔ کسی کے ہاں ملنے جائیں گے تو اس کے بچوں کے لیے مٹھائی، پھل یا کھلونے لے جائیں گے۔

طبیعت میں جماؤ نہیں، ذرا سی خلافِ طبیعت بات ہوئی تو سمجھئے آئی شامت۔ احباب سے ملنے میں پہل کرتے ہیں۔

جگر صاحب گھر کی بجائے سفر میں رہتے ہیں۔ انھوں نے اتنا سفر کیا ہوگا کہ

اگر وہ تمام اعداد وشمار جمع کر لیے جائیں، تو مجموعی حیثیت سے انھوں نے
متعدد بار تمام دنیا کا سفر کر لیا ہوگا۔

جگر صاحب ہر بات میں نفاست پسند ہیں۔ نفاست انکی زندگی ہے یا یہ نفاست
کی زندگی ہیں۔ بظاہر ان کی نفاست پر کوئی زندگی نہیں برستی۔ یہی وجہ ہے کہ کسی
نے پہلی بار انھیں کسی مشاعرے میں پڑھتے سُنا، تو اُس نے باآواز بلند کہا کہ جتنے
یہ بدصورت ہیں۔ پڑھتے ہوئے اتنے ہی خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ البتہ جن کی
نظریں ان کے چہرے سے ہٹ کر ان کے دل کو ٹٹول آتی ہیں۔ وہ چہرے کے
بھدے سے سیاہ رنگ کو بھول جاتے ہیں۔ یہ ملنے والوں کا ہر دم خیال رکھتے ہیں
لاہور ہی کا ایک قصّہ ہے کہ ایک دن جگر صاحب بڑے ہی پریشان تشریف لائے
آتے ہی کہنے لگے "رات بھر نیند نہیں آئی۔ قصّہ یہ ہے کہ فلاں صاحب میرے پاس
آیا کرتے تھے۔ وہ گرفتار ہو گئے ہیں۔ اس کی والدہ بیچاری میرے پاس روتی پیٹتی
آئی تھی وہ لوگ بڑے ہی بے سہارا اور بے یار و مددگار ہیں۔ میں صبح سے
اب تک ڈپٹی کمشنر اور فلاں فلاں افسروں کو ٹیلیفون کرا چکا ہوں اور اُن سب سے
کہہ چکا ہوں کہ اوّل تو وہ صاحب بڑے نیک سیرت ہیں۔ اگر وہ صاحب آپ کے
خیال میں مجرم ہیں پھر بھی چھوڑ دیں۔ اس لیے کہ کسی غریب کو روتے دیکھتا ہوں
تو سمجھتا ہوں کہ کائنات ہل رہی ہے اور ہم ابھی بھسم ہوئے کہ ابھی —— نہ جانے
وہ اب تک رہا ہو کر آیا ہے کہ نہیں۔ چلو اس کے گھر چلیں۔"

میں نے کہا کہ "میں نے تو ان کا گھر نہیں دیکھا۔ آپ کو معلوم ہے؟"

کہنے لگے۔ معلوم تو مجھے بھی نہیں، کل ان کی والدہ نے کچھ اتا پتا بتایا تھا، ڈھونڈھ لیں گے، مل ہی جائے گا۔"

چنانچہ صاحب اُس محلے میں پہنچ کر کبھی میں نے اور کبھی جگر صاحب نے اُن صاحب کا پتہ پوچھا۔ بہ ہزار دقت اُن کا مکان ملا۔ باہر ہی سے معلوم ہو گیا کہ وہ صاحب گھر آ چکے ہیں۔ یہ سنتے ہی جگر صاحب نے الحمد للہ کہا اور واپسی کے لیے پلٹے۔

میں نے کہا: "ان کے گھر والوں کو تو اپنی آمد کی اطلاع دے دیں۔"

کہنے لگے "کسی کی مدد کرنے کے بعد اُسے شرمسار نہیں کرنا چاہیئے۔"

جگر صاحب بڑی بھول بھلیاں ہیں۔ انھیں کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ آپ کا اُن کا ہفتوں ساتھ ہو جائے اور اتفاق سے درمیان میں دو چار برس ملاقات نہ ہو، تو وہ آپ کو قریب قریب بھول جائیں گے۔ دوبارہ ملاقات پر جب آپ اُن سے کہیں گے کہ جگر صاحب مجھے پہچانا؟" تو وہ کہیں گے "بھئی کچھ آنکھیں مانوس ہیں اس وقت یاد نہیں آ رہا کہ کہاں ملاقات ہوئی تھی۔" اب انھوں نے یادداشت کا یہ طریقہ نکالا ہے کہ ایک ڈائری پر لکھتے رہتے ہیں۔ لیکن بُرا ہو یادداشت کا کہ اب انھیں یہ پتہ نہیں کہ ڈائری کہاں رکھی تھی۔ حفظِ ماتقدم کے لیے وہ عرصے سے اپنے ساتھ ایک ڈکار رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ان کے یوں کھوئے کھوئے رہنے سے کبھی لوگ ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ اپنی سینکڑوں چیزیں گم کرتے رہتے ہیں۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں نے لکھنؤ میں یہ بات سنی کہ کل جگر صاحب کا بٹوہ گم ہو گیا ہے اور اس میں ہزار بارہ سو روپے تھے۔ چنانچہ بھوپال ہاؤس اس حادثے کے افسوس کے لیے

پہنچا، اور پوچھا۔

"آپ کو کچھ معلوم نہیں کہ بٹوہ کیسے اور کہاں گم ہوا؟"

کہنے لگے۔ "مجھے سب معلوم ہے۔ کل ایک صاحب سے چلتے چلتے ملاقات ہوئی تھی۔ اُنھوں نے بڑی نیاز مندی کا اظہار کیا۔ میں نے سوچا کوئی ملنے والا ہوگا۔ بازار سے کچھ سودا سلف خریدا۔ پھر تانگے میں بیٹھے اور یہاں آئے۔ راستے میں اُن صاحب نے میری جیب میں سے کچھ نکالا۔ میں نے سوچا مجھے بدگمانی ہوئی ہے۔ یہ بات نہیں ہو سکتی۔ جب جیب کو ٹٹولا، تو بٹوہ غائب تھا۔ میں نے اپنا بٹوہ ان کے پاس اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لیا۔ لیکن میں نے اُن سے کچھ کہا نہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"

کہنے لگے۔ "اگر میں اس سے یہ کہتا کہ میرا بٹوہ آپ نے چرا لیا ہے، تو اس وقت جو اُسے پشیمانی ہوتی، وہ مجھ سے نہ دیکھی جاتی۔"

داستان خواہ مخواہ طویل ہوگئی ورنہ بات تو دو سطروں میں ہو سکتی تھی وہ یوں کہ جگر صاحب کی شخصیت نے مجھے بہ حیثیت انسان کے اتنا متاثر کیا ہے کہ ایسے لوگوں کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی ہے۔ یہ میری بھی بدقسمتی ہے اور ماحول کی بھی

فراق صاحب

(۱)

میرے کراچی جانے کا پروگرام طے تھا۔ معلوم ہوا کہ انہی دنوں کراچی میں ایک بڑے وسیع پیمانے پر مشاعرہ ہو رہا ہے۔ اس میں بھارت سے جوش ملیح آبادی، فراق گورکھپوری اور آثر لکھنوی آرہے ہیں اور مشاعرے کی صدارت نیاز فتحپوری کریں گے (جگر صاحب اُن دنوں پاکستان ہی میں تھے۔ اس لیے میں نے اُن کا نام ہند سے آنے والے شعرا کے ساتھ نہیں لیا) اگر میں اپنے پروگرام کے مطابق کراچی پہنچتا تو مشاعرہ دو دن پہلے ہو چکتا۔ اس لیے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ مشاعرے کی خاطر دو دن پہلے کراچی پہنچنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے فل اسپیڈ کے ساتھ اپنے یہاں کے کاموں کو سنبھالا اور دو دن پہلے کراچی کے لیے روانہ ہو گیا۔

مجھے نیاز صاحب، فراق صاحب، جوش صاحب اور آثر صاحب سے ملنے کا

بڑا اشتیاق تھا۔

نیازؔ صاحب سے میری کئی ایک ملاقاتیں ہو چکی تھیں۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ جب میرا نیازؔ صاحب سے ملنا چنداں دشوار نہ تھا۔ یعنی پاکستان معرضِ وجود میں نہیں آیا تھا۔ اُن دنوں تو جب جی چاہتا ٹکٹ کٹوا کر لکھنؤ جا کر ان سے مل سکتا تھا۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد تو تعلقات بھی تقسیم ہو کر رہ گئے تھے۔ اس لیے ان سے ملنے کے اس موقع کو غنیمت جانا۔

فراقؔ صاحب سے نیاز حاصل نہ تھا۔ البتہ خطوں کے ذریعے آپس میں بڑی یگانگی اور بڑے قرب کا احساس تھا۔ حتیٰ کہ اتنی دور ہوتے ہوئے بھی ہم میں سے ایک چھوٹا بھائی تھا اور ایک بڑا۔

جوشؔ صاحب سے نہ خط و کتابت تھی نہ ملاقات۔ یہ کیا ہوا کہ میں نے انھیں خط لکھا اور انھوں نے میرے خط کا جواب خود نہ دیا۔ بلکہ میری فرمائش کی تعمیل اپنے کسی ساتھی سے کہہ کر کرا دی۔

اثرؔ صاحب سے صرف خط و کتابت تھی۔ سچی بات ہے کہ میں اُن کے خلوص اور ان کی "بزرگانہ معصومیت" کا پہلے سے معترف تھا۔

جگرؔ صاحب اور میں لاہور سے اکٹھے ہی کراچی کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ جس صبح ہم کراچی پہنچے، اُسی کی شام مشاعرہ تھا۔ بانیانِ مشاعرہ میں سے ایک صاحب گاڑی کو ٹٹولتے ٹٹولتے کراچی چھاؤنی کے اسٹیشن پر آ نکلے، اور انھوں نے جگرؔ صاحب کو دیکھ کر الحمد للہ کہا۔ اور جب انہی صاحب نے یہ مژدہ سنایا کہ جوشؔ، فراقؔ، اثرؔ اور نیازؔ کراچی پہنچ چکے ہیں تو میں نے بھی دل میں کہا۔ الحمد للہ!

رات کو مشاعرے میں پہنچ کر یوں محسوس ہوا کہ جیسے کراچی کے تمام باشندے جمع ہو گئے ہوں نہ انہیں چور کی طرف سے کوئی خطرہ رہا نہ بیوی کی طرف سے جبکہ مشاعرے رات کے بارہ بجے اور ایک بجے کے بعد تک بھی چالو رہتے ہوں جدھر دیکھیے سر ہی سر یا اُن پر کچھ برقعے۔ یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ سر الگ سے تھے اور برقعے الگ۔ البتہ کہیں کہیں برقعوں میں سے سر نکلے ہوئے بڑے بھلے معلوم ہوتے تھے۔ کئی سخن شناس شاعروں کی طرف کم (مجھ سمیت) اور برقعوں کی طرف زیادہ متوجہ تھے۔

وہاں کچھ مرکزی حکومت کے وزرا بھی نظر آئے۔ جن پر خوب خوب شعری آوازے کسے گئے اور کچھ وہ صاحبانِ ذوق بھی جو مشاعرہ سننے کے بعد فٹ پاتھ پر جا کر سوئیں گے اور حاصلِ مشاعرہ شعر گنگنائیں گے۔

اتنے میں دیکھا کہ ایک صاحب تشریف لا رہے ہیں اور چند حضرات ان کے پیچھے پیچھے بڑے احترام سے قدم اُٹھا رہے ہیں۔ کسی نے بات چھوڑ دی ——

"نیاز فتحپوری تشریف لے آئے ہیں"

میں نے اُن صاحب کی طرف دیکھا۔ جنہیں نیاز صاحب بتایا جا رہا تھا لیکن وہ مجھے نیاز فتحپوری نہ دکھے۔

تھوڑے سے وقفے کے بعد جب صدارت کے لیے نام پکارا گیا تو وہی صاحب اُٹھے جنہیں تھوڑی دیر پہلے نیاز فتحپوری ماننے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ چند برسوں میں اتنا تغیر! —— دھچکا لگا —— چہرے پر جھریاں —— ضعیفی کا بھرپور وار —— چال میں لڑکھڑاہٹ —— باتوں میں تیقن —— آواز میں بے یقینی —— خیر آپ اس بے یقینی اور اس دھچکے بازی

کو جانے دیں اس لیے کہ میں تو بات فراقؔ صاحب کی کہنے نکلا تھا۔ بہرحال جو باتیں اس سلسلے میں ضمناً نکلتی آئیں اُن کا کیا علاج۔ مجھے بھی تو آپ کو باتوں باتوں میں بہلانا ہے اس لیے کہ فراقؔ صاحب کی شخصیت کے بارے میں میری معلومات بڑی محدود ہیں۔

مشاعرے کی کارروائی حفیظؔ جالندھری صاحب کے خطبۂ استقبالیہ سے شروع ہوئی۔ انھوں نے اپنے ہمعصروں کے استقبال کے لیے خوب خوب فقرے چُنے۔ اُن میں مہمان شعرا کی بڑائی کے اعتراف کے ساتھ ساتھ اپنے کم نہ ہونے کا بھی احساس شامل تھا۔ مجھے تو اُن کے اس تعارف اور استقبال نے مزا دیا۔ البتہ بعض حضرات ناک بھوں چڑھا رہے تھے۔ خود جن کی شان میں یہ سب کچھ کہا جا رہا تھا، وہ بھی پینترے بدل رہے تھے۔ میرا خیال ہے کہ انھیں اپنے ہمعصر شعرا سے چُہلیں اور لاڈ کرنے کا پورا پورا اختیار دینا چاہیے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے حق میں سے وہاں کچھ صرف کر رہے تھے۔

اس کے بعد نیازؔ فتحپوری صاحب نے بڑے عالمانہ انداز میں سندھ کی تاریخ اور اُردو شاعری کی تاریخ پر بڑا جامع تبصرہ کیا۔ وہ خطبۂ صدارت اپنی نوعیت کے اعتبار سے منفرد اور بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

پھر تو ایک کے بعد ایک شاعر۔

مشاعرہ خوب جما ہوا تھا۔ کسی کو ہوٹنگ اور کسی کو داد سے نوازا جا رہا تھا کہ اتنے میں جوشؔ صاحب اور فراقؔ صاحب مع اپنے "ڈنڈھچر" کے (ڈنڈھچر۔ ڈنڈے اور چھڑی کے درمیان درمیان جو چیز بنتی ہے اُسے ڈنڈھچر کہہ لیجیے) تشریف لے آئے۔

جوشؔ صاحب یوں آرہے تھے کہ جیسے ایک فاتح اپنی مملکت میں داخل ہو رہا ہو۔ فراقؔ صاحب کے قدم کبھی ادھر پڑتے تھے کبھی اُدھر، اور بھٹی بھٹی نگاہوں سے سامعین کو گھور رہے تھے، جیسے کہہ رہے ہوں کہ بھئی جاؤ۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو۔

جب یہ شعراء ڈائس پر آکر بیٹھ گئے تو جگرؔ صاحب بھی آپہنچے۔ اب ذرا سامعین کے تبصرے سنئے:

"وہ تو جوشؔ صاحب ہیں، اور ان کے ساتھ فراقؔ صاحب معلوم ہوتا ہے فراقؔ نے بے تحاشا پی رکھی ہے۔ اور ان دونوں کے بیچ میں سے جو صاحب سر نکال رہے ہیں جانے اسے بین الاقوامی نمائش سے کیوں پکڑ لائے ہیں۔ اس نکڑ پر جگرؔ صاحب بیٹھے ہیں اور جیب سے پان کی ڈبیہ نکال کر پان کھانے والے ہیں۔ کاش! اُگالدان بھی ساتھ لائے ہوتے تاکہ سہولت ہی سہولت رہتی۔ ذرا پرے وہ ــــ وہ اثرؔ لکھنوی ہیں، انھوں نے خوب چپ سادھ رکھی ہے۔ نہ کسی سے کچھ کہتے ہیں، نہ کسی کی سنتے ہیں بڑے اللہ والے معلوم ہوتے ہیں۔ وہ دیکھیے حفیظؔ جالندھری صاحب نیازؔ صاحب کے کان میں شاہنامۂ اسلام حصۂ پنجم کا تذکرہ کر رہے ہیں، اور ان سب کے بیچ میں نیازؔ صاحب راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں۔"

کوئی کہتا کہ نہیں فلاں صاحب کے ساتھ فلاں صاحب بیٹھے ہیں۔ کوئی کہتا نہیں نہیں وہ نہیں ہیں وہ تو فلاں حضرت ہیں ــــ کوئی ان سارے تبصروں پر پانی پھیر دیتا اور کہتا ــــ چھی چھی!

اتنے میں فراقؔ صاحب اپنی جگہ سے اُٹھے۔ ڈائس سے نیچے اُترے اور چل دیے۔

بانیانِ مشاعرہ میں سے دو ایک صاحب لپکے ــــ "حضرت کدھر" ــــ ؟

کہنے لگے "ہوٹل واپس جا رہا ہوں"

"حضور دو منٹ تو رکیے۔ ایک آدھ غزل پڑھ کے چلے جائیے گا"

"نہیں، نہیں میرا یہاں آجانا ہی کافی ہے۔ ان لوگوں نے میری صورت دیکھ لی ہے یہی کافی ہے۔ شعر پھر کبھی پڑھیں گے"

میں چونکہ ڈائس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے یہ ساری باتیں سن رہا تھا۔ فراق صاحب کی اس گفتگو پر اُن صاحب کو سردیوں میں بھی پسینہ آگیا اور انھوں نے بڑی ہی بےکسی کے انداز میں کہا "حضور چند منٹ رکیے۔ پھر تشریف لے جائیے گا"

اس پر آپ واپس جا کر ڈائس پر بیٹھ گئے اور ایک صاحب کے کان میں جا کر باتیں شروع کر دیں۔ نہ جانے کیا۔

صاحبِ صدر سے گزارش کی گئی کہ فراق صاحب سے جلد پڑھوا لیا جائے۔ چنانچہ ان کی باری جلد آگئی۔ حفیظ جالندھری نے اعلان کیا کہ اب اُردو کے بڑے غزل گو شاعر اور ہمارے معزز مہمان جناب فراق گورکھپوری اپنا کلام سنائیں گے۔ یہاں میں نے حفیظ صاحب کے اعلان کا ترجمہ کر دیا ہے اس لیے کہ اب نہ مجھے اُن کے الفاظ یاد ہیں اور نہ میں ویسے الفاظ گھڑ سکتا ہوں۔ اس لیے منہ چڑانے سے فائدہ!

چنانچہ فراق صاحب نے ڈنڈ طپھڑ کو الوداع کیا جیب میں سے عینک اور بیاض نکالی۔ لڑکھڑاتے ہوئے اُٹھے۔ مائیکروفون کے پاس پہنچے۔ بیاض کے صفحات پلٹے اور اپنے کلام میں غرق ہو کر ایک رباعی چھیڑی۔ ہر مصرعے کے آخری دو ایک الفاظ

دبا جاتے تھے۔ پڑھتے پڑھتے انھوں نے ہاتھ جو اُوپر اٹھایا تو اُوپر اُٹھاتے ہی چلے گئے۔
یوں محسوس ہوتا تھا کہ اب اُڑنے لگیں گے کبھی جھوم کر ایک طرف کو سرک گئے۔ جیسے
کسی سے پوچھنے جا رہے ہوں کہ شعر کیسا رہا۔ اُن کی ان اداؤں نے بھی شعروں میں حسن
پیدا کر دیا۔ نئی نئی تشبیہات اور استعارے، شعروں میں ہندی کے پیارے پیارے
الفاظ کا بیچ اور اُردو کے نئے نئے الفاظ (جو صرف فراق کی لغت میں ملیں گے) نے
سامعین کو مدہوش کر دیا۔ اس وقت فراق صاحب کی شراب کا نشہ وقتی تھا۔ لیکن ان
کے شعروں میں جو نشہ تھا اور ہے وہ وقتی نہ تھا۔ اس لیے سامعین کی حالت فراق صاحب
سے زیادہ خراب تھی۔ یہ بھی موڈ میں آگئے۔ انھوں نے پے بہ پے کئی رباعیاں پڑھ ڈالیں۔
لوگوں نے بھی دل کھول کر اور گلے پھاڑ پھاڑ کر داد دی۔

کسی نے حکم دیا کہ "مطرب سے کہو کہ اس انداز سے گائے"۔ والی غزل۔

"غزل بھی پیش کروں گا، پہلے ایک رباعی اور سن لیں۔ جی ہاں رباعی"۔

چنانچہ انھوں نے رباعیاں، غزلیں اور دو ایک نظمیں بھی سنا ڈالیں۔ یہ پڑھ پڑھ کر
تھک گئے لیکن سامعین تھے کہ وہ ان سے رات بھر پڑھوانے کا ارادہ رکھتے تھے۔
اب نہ تو ان کی آواز ٹھیک سے نکلتی تھی اور نہ کھڑا ہی رہا جاتا تھا۔ اس لیے
ہوش صاحب کے نام کا اعلان ہوا۔

چونکہ میں اُس مشاعرے کی روداد نہیں لکھ رہا ہوں (حالانکہ ہے وہی) اس لیے
باقی شعرا کا ذکر ضمناً کر رہا ہوں لہٰذا میری ان سطروں کو کسی دوسرے شاعر کی طرف سے
بے اعتنائی پر محمول نہ کیا جائے۔

دوسرے دن ریڈیو اسٹیشن میں محفل شعر و سخن جمی۔ سارا دن اعلان ہوتا رہا کہ ہندوستان سے آنے والے تمام شعرا شریک ہوں گے جس وقت میں ریڈیو اسٹیشن پہنچا ہوں اُس وقت مشاعرہ ختم ہی ہونے والا تھا اور اب تک نہ جوش صاحب پہنچے تھے اور نہ فراق صاحب ریڈیو والے پریشان تھے کہ یہ بہت بُرا ہوا۔ اتنے میں جوش صاحب مع فراق صاحب کے یا فراق صاحب مع جوش صاحب کے آ نکلے۔ سب کے چہرے تمتما اُٹھے۔ ابھی یہ بیچارے اپنی سانس بھی بحال نہیں کر پائے تھے کہ اناؤنسر کو کہنا پڑا۔" اب فراق گورکھپوری اپنا کلام سنائیں گے۔"

اس پر فراق صاحب نے کہا "حاضر ہوتا ہوں"۔۔۔ ان کا حاضر ہونا براڈ کاسٹ ہو گیا۔ اس اثنا میں ریڈیو کو کافی دیر چپ لگی رہی۔ جب یہ گویا ہوئے تو کئی چیزیں سنائیں۔ جب جوش صاحب کی باری آئی اور یہ الگ جا بیٹھے تو میں نے انھیں ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بُلایا۔ یہ اُس سرے پر بیٹھے ہوئے تھے اور میں اِس سرے پر۔ جب انھوں نے میرا اشارہ دیکھا تو تصدیق کی خاطر انھوں نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو جنبش دی۔ جب میں نے اثبات میں سر ہلایا، تو فراق صاحب میرے پاس آئے اور کہا۔ فرمائیے۔"

میں نے آہستہ سے اپنا تعارف کرایا کہ" میرا نام طفیل ہے۔"

کہنے لگے کہ "بس اتنی سی بات تھی"

اس پر میں بڑا شرمندہ ہوا۔ سوچا کہ مجھے اپنا حدود اربعہ عرض کرنا پڑے گا۔ چنانچہ میں نے اپنا تعارف کرانے کی خاطر جغرافیے کا پہلا سبق دُہرا ڈالا۔

پھر تو فراق صاحب ایک دم خوش ہو گئے اور بلند آواز میں میری خیریت، کاروبار اور قیام وغیرہ کے بارے میں پوچھ ڈالا۔

چند ایک حضرات نے فراق صاحب سے کہا کہ آپ اس وقت ریڈیو اسٹیشن پر بیٹھے ہیں اور مشاعرہ براڈ کاسٹ ہو رہا ہے۔ اس لیے ذرا آہستہ آہستہ بولیے: کہنے لگے "آہستہ خاک بولوں، مدتوں کے بعد تو ان سے ملاقات ہوئی ہے۔ اب آپ لوگ ہمیں بولنے بھی نہیں دیتے۔ کیا ہرج ہے اگر ہماری گفتگو بھی براڈ کاسٹ ہو جائے۔"

۔۔۔ اس کے بعد مجھ سے آہستہ سے کہا "بہت اچھا ہوا کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔ جوش صاحب تو کراچی آ ہی نہیں رہے تھے، میں تو انھیں زبردستی لایا ہوں۔ راستہ بھر مجھے گالیاں دیتے آئے ہیں۔ یعنی مطلعے کہتے آئے ہیں۔ اگر ہم یہاں نہ آتے تو آپ سے ملاقات کیسے ہوتی؟"

"پھر بھی ہو جاتی۔"

"پھر تو ہم یہاں ناحق آئے۔"

طے ہوا کہ دوسرے دن صبح ہوٹل میں ملاقات ہو گی۔

میں صبح آٹھ بجے ہی برسٹل ہوٹل جا پہنچا۔ دیکھا تو فراق صاحب غائب اور جوش صاحب حاضر۔ جوش صاحب کے سامنے چائے رکھی ہے اور وہ گریپ فروٹ کا پانی نکال رہے ہیں۔ میری جوش صاحب سے روشناسی نہ تھی۔ اس لیے آداب کہہ کر فراق صاحب کی بابت پوچھا کہ کہاں ہیں؟"

جوش صاحب نے جواباً کہا۔ ابھی ایک نہایت نامعقول قسم کے صاحب آئے تھے۔

پہلے تو دونوں کھسر پھسر کرتے رہے۔ پھر وہ ان حضرت کو لے گئے۔ جانے کہاں گئے۔ میں چپکے سے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

وہاں میرے ہاتھ ایک اخبار لگا۔ میں اُسے دیکھ ہی رہا تھا کہ جوش صاحب نے کہا۔ "لیجئے آگئے۔"

فراق صاحب "واہ وا۔ کہئے حضرت کتنی دیر ہوئی آئے ہوئے؟"

بجائے میرے جوش صاحب بولے "آپ کو کیا۔ آپ چاہیں گھامڑ قسم کے لوگوں کے ساتھ۔"

فراق صاحب بڑے حاضر جواب اور بات کی تہہ تک پہنچنے والے نکلے اس لیے انھوں نے کہا۔ اگر وہ صاحب یہاں بیٹھے رہتے تو آپ اُن سے کہتے کہ نکل جایئے کمرے سے، اس لیے میں خود انھیں کمرے سے باہر کر آیا ہوں۔"

جوش صاحب نے کہا۔ "اگر وہ صاحب بیٹھے رہتے تو میں آپ سے بھی یہی عرض کرتا۔"

فراق صاحب نے جواب دیا۔ ایسا وقت پڑنے پر اساتذہ کا دستور رہا ہے کہ خود کمرے سے باہر نکل گئے ہیں تاکہ عقل خرچ نہ ہو۔"

"یہ بنیا ہر وقت جمع خرچ کے پھیر میں رہتا ہے"

دیکھئے جوش صاحب ہم آپ کو صدق دل سے بڑا شاعر مانتے ہیں لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ آپ کی شاعری کا مسلسل نشانہ یہ خاکسار ہی بنتا رہے۔ ایسی آفاقی تشبیہات اور ایسے نادر استعاروں کو کہیں اور برتئے۔ میں تو پہلے ہی آپ کا مداح ہوں۔

اتنے میں باہر سے دو صاحبان کمرے میں داخل ہوئے۔ فراق صاحب نے

انھیں دیکھتے ہوئے کہا۔ "لیجیے آ گئے۔"

جوشؔ صاحب نے کہا۔ "کون ؟"

فراقؔ صاحب نے جواب دیا۔ کسی سرکاری رسالے کے ایڈیٹر معلوم ہوتے ہیں۔"

جوشؔ صاحب بات کو پا گئے اور کہا۔ "علامات تو پروفیسر از ہیں۔"

ابھی فراقؔ صاحب کوئی جواب بھی نہ دے پائے تھے کہ وہ صاحبان سروں پر آ کھڑے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ کالج کے اسٹوڈنٹ ہیں اور آٹوگراف لینے آئے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ ایک دعوت پر چلے گئے —— پھر ان سے ملاقات نہ ہو سکی۔

یہ تھے ایک مختصر سی ملاقات کے چند تأثرات —— تأثرات جو لحظہ بہ لحظہ بدلتے رہتے ہیں۔

(۲)

مجھے فراقؔ صاحب کے فن سے محبت تھی۔ خط و کتابت میں بھی خلوص نظر آیا تھا۔ کراچی میں جب ملاقات ہوئی تو مجھے ان کی ذات سے بھی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ یہی وجہ تھی کہ میں نے لاہور پہنچ کر، ان کی ذات کے بارے میں خطوں کا ایک طویل سلسلہ شروع کر دیا۔

ارادہ تھا کہ ان خطوں کی روشنی میں ان پر ایک مضمون لکھوں گا جیسے جیسے خط

آتے گئے ہیں اس صورت میں ان پر مضمون لکھنے کا ارادہ ترک کرتا گیا۔ اس لیے کہ ان خطوں میں بہت کچھ تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ خود غرض بن کر اُس قیمتی ادبی سرمائے کو اپنے لیے محفوظ کر لیتا اور کفارہ یوں ادا کرنے کی کوشش کرتا کہ ان خطوں کی روشنی میں ان پر ایک مضمون لکھ دیتا۔

فراق کے خطوط[1] نقوش ۴۳ء، ۴۴ء میں شائع ہوئے تھے۔ جسے میں آج بھی اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ سمجھتا ہوں۔ اُن میں سے ایک خط کا اقتباس پیش کرتا ہوں، جو ان کی شخصیت ہی کے بارے میں ہے:۔

۸/۴ بینک روڈ۔ الہ آباد

۱۲ر فروری ۱۹۵۳ء

برادرم طفیل صاحب

ایک مدت ہو گئی جب آپ کا محبت نامہ ملا تھا۔ میری بد توفیقی دیکھئے کہ اندازاً چار ماہ بعد جواب لکھنے بیٹھا ہوں، ادھر کئی برسوں سے میرے لیے بڑی مصیبت یہ ہو گئی ہے کہ میرے پاس جتنی بھاری ڈاک آتی ہے اس کا جواب دینا میرے بس کی بات نہیں، آپکے خطوط تو میرے دل و دماغ میں تازگی پیدا کر دیتے ہیں، لیکن بہت سے خطوط ایسے بھی آتے ہیں جن میں احباب خلوص و محبت کی باتیں تو لکھتے ہیں لیکن جنھیں پڑھ کر

---

[1] اُن خطوط کو: دو خطوط سمیت الگ کتابی صورت میں پیش کر رہا ہوں۔

عموماً تھکاوٹ سی محسوس کرتا ہوں، شہرت میرے لیے ایک مصیبت ہو گئی ہے۔ پھر میری حیثیتیں بھی کئی ہیں۔ اردو، ہندی، انگریزی، تمام حلقوں سے نظموں، غزلوں، نثر کے مضامین، پیغامات، صلاح مشورے کی مانگیں آتی رہتی ہیں، جو ذہن میں ایک پراگندگی اور انتشار پیدا کر دیتی ہیں۔ پھر لکچروں اور تقریروں کی بھی مانگیں آتی رہتی ہیں اور ان سب پر مستزاد انگریزی ادب کے معلّم کے کارِ منصبی کی ذمہ داریاں، ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ جاتا ہوں۔ میرے لیے میری ڈاک صرف امیدوں کی حامل نہیں ہوتی بلکہ امید وبیم کی حامل ہوتی ہے۔ صحت کی خرابی، نیم خوابی، سوداوی مزاج کی وجہ سے طبیعت کا انتشار، گھٹن اور گھبراہٹ، جسم کی مستقل تھکن، ہاتھ میں رعشہ آ جانے کی وجہ سے لکھنے سے معذوری، ان تمام بلاؤں میں مبتلا ہوں، بہرحال کام میں کیے جا رہا ہوں اور ہانپ ہانپ کر ایک ادیب کے فرائض جیسے تیسے پورے کرتا جا رہا ہوں۔ عمر بھی ساٹھ کے لگ بھگ ہے (تاریخ پیدائش: ۲۸؍اگست ۱۸۹۶ء) پھر بھی اپنے شعور کو کچھ ایسی تربیت دے سکا ہوں کہ داخلی سکون کا سررشتہ ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اس امر کا خیال رکھتا ہوں کہ جو جو طوفان اٹھتے ہیں، وہ میری شخصیت کی سطحوں پر اگر ہلچل مچا دیں تو بھی میرے شعور کی گہرائیاں اپنا سکون و توازن قائم رکھیں۔

آپ نے تو ایک سانس میں کئی باتیں کہہ دی ہیں لیکن میں سانس

لے لے کر بھی سب باتیں کہنا چاہوں، تو بھی آپ کی ساری باتوں کا جواب مشکل ہے۔ بہرحال آپ سے کچھ کہے بغیر جان چھڑانا مشکل ہے، اس لیے آج یہ عرض کیے دیتا ہوں کہ "مجھے شعر کہنے کے لیے کسی خاص ماحول یا موڈ کی ضرورت ہوتی ہے یا نہیں؟"

بظاہر میری زندگی کا خارجی ماحول دوسروں کی زندگی کے خارجی ماحول سے زیادہ مختلف نہیں ہے، میرا تعلق وسطی طبقے سے ہے اور اس طبقے کی عام خصوصیتیں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس طبقے کی اچھی بُری باتیں، خوبیاں اور کمزوریاں اپنی زندگی میں بھی پاتا ہوں۔ اس کے باوجود اپنی ایک انفرادی شخصیت بھی رکھتا ہوں جس کے نمایاں خدوخال ہیں اور جو مجھ کو اپنے ہمچشموں سے ممتاز کرتی ہے۔ بچپن ہی سے میں اپنے بھائی بہنوں سے اپنے کو بہت مختلف پاتا تھا۔ مثلاً میں ان سب سے زیادہ جذباتی تھا۔ محبت اور نفرت کی غیر معمولی شدت میں اپنے اندر پاتا تھا۔ مانوس چیزیں بھی مجھے حد درجہ مانوس اور حد درجہ عجیب محسوس ہوتی تھیں۔ مناظرِ قدرت سے میں اتنا متاثر ہوتا تھا کہ اُن میں کھو جایا کرتا تھا۔ میرے بچپن کی دلچسپیاں بھی بہت شدید قسم کی ہوتی تھیں۔ بچپن کے کھیل اور کھلونوں سے بھی اتنی زبردست لگاوٹ محسوس کرتا تھا کہ گھر والے تعجب کرتے تھے اور کبھی کبھی میرا مذاق اُڑاتے تھے۔ میری والدہ کا کہنا ہے کہ دو تین برس کی عمر ہی سے میں کسی بدصورت مرد یا عورت کی گود میں جانے سے انکار کر دیتا تھا۔

بلکہ یہاں تک ضد کرتا تھا کہ ایسے لوگ گھر میں نہ آنے پائیں۔ اس کی خوب ہنسی اُڑتی تھی۔ اور کبھی کبھی اس کے لیے مجھے چڑایا بھی جاتا تھا۔ نو دس برس کی عمر ہی سے جس لڑکی یا لڑکے کو مرد یا عورت کو اپنے نزدیک میں خوبصورت سمجھتا تھا۔ اُسے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میرا جسم بلکہ میری ہڈیاں تک پگھل کر رہ جائیں گی۔ شعوری طور پر احساسِ حسن سے برانگیختہ ہونے والی جنسیت میرے اندر سِن بلوغ سے کافی پہلے پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ زندگی میں اچھائی، خلوص اور شرافت کی قدریں بھی مجھے غیر معمولی طور پر متاثر کرتی تھیں۔ جن گیتوں، کہانیوں اور واقعات میں ان قدروں کی جھلک دکھائی دے جاتی اُن سے میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ اگرچہ میرا گھر ایک بھرا ہوا گھر تھا اور میں ٹوٹ کر سب سے ملتا تھا پھر بھی بچپن ہی سے اپنے اندر ایک احساسِ تنہائی پاتا تھا۔ لگے ہاتھوں یہ بھی بتا دوں کہ بچپن میں جو ابتدائی کتابیں پڑھنے کو ملتی تھیں اُن کے حسنِ اسلوب سے میں بہت متاثر ہوتا تھا اور بد اسلوبی سے بدمزہ ہوتا تھا۔ اس طرح زندگی کے سترہ اٹھارہ سال کٹ گئے۔ بارہ تیرہ برس کی عمر ہی سے شعر کہنا چاہتا تھا لیکن جیسا پہلے کہہ چکا ہوں کہ میری زندگی جذبات سے اتنی لبریز تھی کہ اس عمر میں مجھے اظہارِ جذبات کے لیے الفاظ نہیں ملتے تھے اور شعر گوئی کی خواہش گھٹ گھٹ کر رہ جاتی تھی۔ یہ گھٹن میرے لیے بسا اوقات ایک مصیبت بن جاتی تھی۔ اندازاً اٹھارہ برس کی عمر میں میری شادی کر دی گئی۔ میری

بیوی کی شکل وہی تھی بلکہ اُس سے بھی گئی گزری جو اُن لوگوں کی تھی جن کی گود میں جانے سے میں دو تین برس کی عمر میں ہی انکار کر دیا کرتا تھا اور زندگی کی دوسری صلاحیتیں بھی اُن پڑھ انسانوں سے میری بیوی میں کم تھیں میری شادی نے میری زندگی کو ایک زندہ موت بنا کر رکھ دیا۔ زندگی کے عذاب ہو جانے کے باوجود میں نے خودکشی نہیں کی نہ پاگل ہُوا اور نہ جرائم پیشہ بنا نہ زندگی کی ذمہ داریوں سے دست بردار ہُوا۔ اس لیے کہ شدید حسن پرستی کے باوجود زندگی کی شرافت کی جو قدریں مان چکا تھا۔ اُن کا میں نے سہارا لیا۔ فرائض شناسی نے مجھے برباد ہونے سے بچا لیا۔ یہ ضرور ہُوا کہ سال بھر تک مسلسل نیند نہیں آئی اور صحت مستقل طور پر برباد ہو گئی۔ پھر بھی چونکہ علم دوستی کا جوہر بھی مجھ میں تھا۔ اس لیے کالج اور یونیورسٹی کے امتحانوں میں بہت اُونچی پوزیشن لاتا رہا۔ بی۔ اے کا نتیجہ نکلنے سے کچھ پہلے ہی میرے والد منشی گورکھ پرشاد عبرت گورکھ پوری جو شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے، انتقال فرما گئے اور ایک کچی گرہستی کے تمام مسائل میرے سر آ گئے پی۔ سی۔ ایس اور آئی۔ سی۔ ایس دونوں کے لیے میرا انتخاب ہو چکا تھا۔ لیکن بددلی اور بے دماغی نے مجھے اتنا اداس بنا دیا تھا کہ میں دونوں سے مستعفی ہو گیا۔ ان تکلیف دہ اور کرب انگیز حالات میں مَیں نے شاعری شروع کی اور بہت آہستہ آہستہ میں اپنی آواز کو پانے لگا۔ میرا داخلی موڈ اور خارجی ماحول تو بچپن ہی سے بن گئے تھے۔ اب جب شاعری شروع کی تو میری یہ

کوشش ہوئی کہ اپنی ناکامیوں اور اپنے زخمی خلوص کے لیے اشعار کے ذریعے سے مرہم تیار کروں۔ میری زندگی جتنی تلخ ہو چکی تھی اتنے ہی پُرسکون اور حیات افزا اشعار کہنا چاہتا تھا۔ بلکہ یوں کہوں کہ تلخی کو شیرینی میں بدل دینا چاہتا تھا۔ عام طور پر رات گئے اشعار کہنا شروع کرتا تھا اور غزل رات رہے ختم ہوتی تھی۔ کبھی کبھی تو ایسا ہوا ہے، اُدھر پو پھوٹی اور ادھر غزل کا مقطع ہوا۔

اُجلے اُجلے سے کفن میں سحرِ شامِ فراق
ایک تصویر ہوں میں رات کے کٹ جانے کی

فراقؔ صاحب کے ایک اور عجیب و غریب خط کا بھی اقتباس ملاحظہ ہو۔ [illegible]

ایک اور رومان سینکڑوں

میرے رومان تو سینکڑوں رہے ہیں لیکن شدید عشق تین چار ہی اشخاص سے رہے ہیں۔ پہلا عشق ۱۲ دسمبر ۱۹۱۴ء میں ہوا جو چند ہفتوں کی خوشگواریوں کے بعد ہی ناقابلِ برداشت ناکامی میں تبدیل ہو گیا۔ اور یہ پہلا عشق مجھ پر دس بارہ برس تک مسلط رہا۔ دوسرا زبردست عشق ڈیڑھ دو برس تک رہا۔ پھر بغیر کسی اَن بن یا ناخوشگواری کے ہم دونوں کو ایک دوسرے سے جدا ہونا پڑا۔ تیسرا عشق کئی برس بعد ہوا ۱۹۲۹ء میں جو اندازاً سال بھر اس طرح چلتا رہا کہ کبھی انتہائی خوشی اور کبھی انتہائی ناکامی۔ اس کے تین برس کے بعد ایک زبردست عشق ہوا جس میں اندازاً

سال بعد خوش رہ کر بعد کو آٹھ آٹھ آنسو رونے کی نوبت آئی۔ پھر سات برس کے وقفے کے بعد ایک نہت زبردست عشق ہوا جو پانچ سال تک خوشگوار رہ کر ایک مستقل مذہب میں تبدیل ہو گیا "شام عبادت" اسی عشق کی دین ہے اس کے بعد میرا موجودہ رومان ۱۹۵ ء میں شروع ہوا۔ یہ رومان شدید ہونے کی بجائے گہرا اور خاموش ہے اور جذبۂ محبت بہت مستقل اور پائیدار ہے۔ ہوتا یہ رہا ہے کہ جب کسی معشوق سے تعلقات ٹوٹنے لگے ہیں یا ٹوٹ گئے ہیں تو اب لمبے وقفے کے لیے کسی اور سے محبت کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ بچھڑے ہوئے معشوق کو "بھولنے یا بھلانے" میں برسوں لگ جاتے تھے۔ اپنی بدنصیبی کے باوجود میں بے وفا نہیں رہا ہوں البتہ کبھی ان بچھڑے ہوئے معشوق کو بھلائے بغیر بھی جھک مار رہا ہوں۔ مثلاً کچھ لوگوں سے میں نے محبت کی لیکن یہ تجربے قبل از وقت ثابت ہوتے تھے:۔۔

تیرا فراق تو اُس دم ترا فراق ہوا
جب اُن کو پیار کیا میں نے جن سے پیار نہیں"

یہ سب پڑھ کر فراق صاحب کے جو کچھ خطوط ہیں وہ بھی ان کو چھپایا جا سکتا ہے اور وہ بھی ان کو ... دوستوں کے کسی کو دکھایا بھی نہیں جا سکتا۔

میں چاہتا تو یہاں فراق صاحب کے بہت سے خطوط نقل کر دیتا لیکن میں ایسی بددیانتی کروں بھی کیوں۔

(۳)

ایک مختصر سی ملاقات جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں۔ میری کل شخصی جان پہچان کا اثاثہ تھی۔

اس کے بعد ایک ملاقات اور ہوئی۔

فراقؔ صاحب سے وعدہ تھا کہ ہندوستان آیا تو الہ آباد بھی آؤں گا۔ ہندوستان پہنچا تو اپنا وعدہ نبھانا اور فراقؔ صاحب کے ہاں الہ آباد جانا پڑا۔

الہ آباد تین چیزوں کی وجہ سے مشہور ہے۔ ان میں ایک جواہر لال نہرو دوسرے فراقؔ اور تیسرے امرود۔

الہ آباد میں اُردو کے مشہور افسانہ نگار بلونت سنگھ کا ہوٹل بھی ہے۔ چنانچہ میں اپنے سامان سمیت سیدھا ان کے ہاں پہنچا۔ صبح کا وقت تھا۔ بلونت سنگھ صاحب کو اطلاع کرائی تو یہ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد برآمد ہوئے۔ دیر سے آنے کی وجہ میں نے نہ پوچھی۔ اس لیے کہ علی الصبح کوئی بھی معقول سکھ ایک دم سے کسی مہمان سے مل ہی نہیں سکتا۔

کوئی چار بجے کے قریب میں اور بلونت سنگھ فراقؔ صاحب کے ہاں پہنچے۔ یہ ایک پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے۔ چھ سات تکیے ان کے ارد گرد پڑے تھے۔ کمرا اجڑا اجڑا تھا۔ تمام چیزیں بے ترتیب اور گرد اُن تمام چیزوں پر نثار۔

بلونت سنگھ نے کمرے میں داخل ہوتے ہی جو کہا وہ یہ تھا۔ ”دیکھیے ہم کیا چیز

لائے ہیں۔ تعارف ہے ؟"

لیٹے ہی لیٹے۔" بہت اچھی طرح۔"

ہم دونوں بیٹھ گئے۔

باتیں شروع ہوئیں۔ صحت کی خرابی اور بے ڈھنگی مصروفیات کا رونا رونے لگے۔ مگر اتنے خوبصورت فقروں میں کہ مجھے ان کی بیماری اور اوٹ پٹانگ قسم کی مصروفیات میں بھی ایک دلکشی معلوم ہوئی۔

جب بیس پچیس منٹ تک ہم کلام ہونے کا شرف حاصل ہو چکا تو میں نے تاڑ لیا۔ کہ انھوں نے ابھی تک مجھے نہیں پہچانا۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے پوچھنا پڑا:

"آپ کیا سمجھ کر مجھ سے مخاطب ہیں ؟"

"ہماری یونیورسٹی میں پڑھتے ہونا !"

اس پر ہم دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

پھر ۔۔۔ "دو مہینے پہلے بھی تو تم بلونت سنگھ کے ساتھ آئے تھے۔"

اس پر ہم پھر ہنس دئے۔

"ہوں ! بھئی ہنستے کیوں ہو ؟"

"میں طالب علم نہیں ہوں۔ محمد طفیل ہوں۔"

"طفیل، اپنے طفیل۔"

اس کے بعد ایک دم ہڑبڑا کر اُٹھے اور اپنی بڑی بڑی آنکھوں کو ادھر سے اُدھر نچاتے ہوئے، کئی منٹ کی خاموشی میں، اپنی حیرت کا اظہار کرتے رہے۔

"کل ہی تمہارا خط آیا تھا جس کا میں نے اُسی وقت جواب دیا تھا کہ الہ آباد ضرور آنا اور میزبانی کی سعادت مجھے بخشنا۔ لیکن تم آئے اور بلونت سنگھ کے پاس ٹھہر گئے۔ ہاں بھئی پنجابی ہر حال میں پنجابی ہوتا ہے۔"

بلونت سنگھ نے پورا پنجابی بن کر جواب دیا۔ "میرے بھی تو ان سے مراسم ہیں۔"

"جی ہاں، میں بھی تو یہی عرض کر رہا ہوں کہ مجھ سے ایک سکھ بھی اچھا ہوتا ہے۔"

میں نے اپنی طرف سے بیچ بچاؤ کراتے ہوئے کہا۔ "بات تو ایک ہی ہے۔ آپ اچھے شاعر ہیں اور بلونت سنگھ اچھے آدمی۔"

فراق صاحب چپ کیسے رہتے۔ بول پڑے۔ ساتھ ہی اپنی آنکھوں سے کام لیا جو کبھی میری طرف گھماتے تھے اور کبھی بلونت سنگھ پہ گاڑ دیتے تھے اور فرمایا تو یہ "لیجیے ہو گیا فیصلہ، میں ہوں تو بد معاش مگر شاعر اچھا ہوں۔ بلونت سنگھ افسانہ نگار نہیں ہے مگر آدمی اچھا ہے۔"

اب میں اِس تاویل کا کیا جواب دیتا۔

بلونت سنگھ بول پڑے۔ "میں طفیل جی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے میری ایک حیثیت کو تو تسلیم کیا۔"

فراق صاحب! ــــ "جی ہاں خوب تسلیم کیا۔ لیکن اچھا انسان وہ ہے جس میں برائیاں بھی موجود ہوں۔"

"جی؟"

"ہاں، مثلاً فراق!"

بلونت سنگھ نے وضاحت چاہی۔ "کیا مطلب ہے آپ کا؟"

میرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم بقول ایڈیٹر صاحب نقوش لاہور پاکستان اچھے آدمی ہو تو مکمل انسان ہو ہی نہیں سکتے۔"

ہم دونوں پھر فراقؔ صاحب کے ذہن کی بھول بھلیوں میں الجھ کر رہ گئے۔ اس بات کی انھوں نے مزید وضاحت یوں کر دی کہ یہ بات ایک ایڈیٹر اور ایک افسانہ نگار کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ مسئلہ نازک ہے۔

پھر انھوں نے اسی طرح کے کئی نازک مسئلے چھیڑے۔ آخر میں کہاں تک ان کے ذہن کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اُترتا چڑھتا۔ حیران ہو کر الماریوں میں سے کتابوں کو دیکھنے لگا۔ جو صرف انگریزی کی تھیں اور سینکڑوں کتابیں تھیں۔ مگر اُن میں سے بعض کا مطالعہ دیمک کر رہی تھیں۔ بعض میں سے بُو آ رہی تھی۔ بعض کے صفحات دوسرے صفحات کے ساتھ گُتھے ہوئے تھے۔

کتابوں کو ٹٹولنے کے بعد میں نے اُس مسئلے کی روانی کو روکنے کے لیے نیم بیزاری کے سے انداز میں کہا۔ "فراقؔ صاحب کوئی نئی چیز کہی ہو تو وہ ارشاد ہو۔"

"بہت اچھا۔"

فراقؔ صاحب اپنی تازہ غزل جھوم جھوم کر اور لہرا لہرا کے اپنے نزدیک ترنم سے سناتے رہے۔ اُس غزل کے دو تین شعر مجھے اب بھی یاد ہیں:

مُدّت سے پتہ ملا نہ دل کا
شاید کوئی بات ہو گئی ہے

یہ شعر ایسا تھا جسے میرے ساتھ بلونت سنگھ جی بھی سمجھ بیٹھے۔ جب اس شعر پر پہنچے تو ساتھ ہی اس شعر کی اچھائی پر شاندار لفظوں میں تبصرہ کر ڈالا۔ وہ تبصرہ تو مجھے اب یاد نہیں وہ شعر ضرور یاد ہے۔

اِس دور میں زندگی بشر کی
بیمار کی رات ہو گئی ہے

اس کے بعد ایک معمولی سا شعر سنایا اور سنانے سے پہلے اصرار کیا کہ بڑا نازک شعر ہے۔ غور سے سننا۔

ہم نے اس شعر کو جب اپنے نزدیک بڑے غور سے سُنا تو بھی مجھے اس میں کوئی بات نظر نہ آئی۔ انھوں نے تو اپنا بھرم یہ کہہ کر رکھ لیا کہ شعر بڑا نازک ہے اس حالت میں ہم اپنے شعری ذوق پر سی لعنت ملامت کریں تو کریں۔ اُس شعر کو خراب کیسے کہیں۔

ایک اور شعر پر پہلے تو جھومتے رہے۔ گویا ہوئے تو یوں فراق کے رنگ کا شعر سُنو" ۔

اکا دکا صدائے زنجیر
زنداں کی رات ہو گئی ہے

بے شمار پیاری پیاری باتیں اور ایک غزل سنانے کے بعد نعیم خیال آیا کہ مہمانوں کو تو چلتے بھی بلانی چاہیے تھی۔ چنانچہ غزل سے چونک کر نوکر کو بلایا۔ جب اُس نے جواب میں جی کہا تو انھوں نے اِدھر سے COME HERE کہا۔

نوکر آیا تو اس سے کہا۔ "بڑی فرسٹ کلاس چائے، اُس فرسٹ کلاس کی سیٹ میں لانا، جو الماری میں پڑا اُونگھتا رہتا ہے۔ خبردار جو اس سیٹ میں لائے جو چار روپے والا ہے۔ میری تو اُس ٹی سیٹ سے کچھ مناسبت بھی ہے۔ لیکن یہ بیچارے تو لاہور سے آئے ہیں۔"

چائے آئی۔

بلونت سنگھ نے بنائی۔

میں چائے بنانے لگا تھا۔ مگر ٹوک دیا گیا۔ "نہ نہ ایسا ظلم نہ کرنا چائے ایک سکھ ہی اچھی بنا سکتا ہے۔"

چائے کی جب پہلی چسکی فراق صاحب نے لی تو بدمزہ ہو گئے۔ نوکر کو گالی دی اور بلونت سنگھ سے بھی ناخوش ہو گئے۔

دوبارہ چائے بنوائی۔

پی تو وہ ٹھنڈی۔ ان کی طبیعت بڑی "غصہ آور" ہے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ چائے پیتے رہے اور نوکر کو انگریزی میں گالیاں دیتے رہے۔

چائے ٹھنڈی کیسے نہ ہوتی۔ اُدھر نوکر چائے لے کر آیا تھا۔ ادھر ہم تینوں شعر و شاعری میں اتنے غلطاں تھے کہ اس وقت چائے کی قدر و قیمت ہی نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ چائے کو ٹھنڈا ہونا ہی تھا۔ بہر حال جتنی چائے بدمزہ تھی۔ اُتنے ہی بامزہ شعروں نے لطف دیا۔

انھوں نے بھی اس ایقان کے ساتھ شعر سُنائے کہ جیسے ہمیں سمجھانے بھی جا رہے

ہوں کہ اب کوئی اس سے بھی اچھے شعر کیا کہے گا۔

یہ باتیں کرتے جاتے ہیں اور سگرٹ پیتے جاتے ہیں۔ جتنی زیادہ باتیں کرتے ہیں اتنے ہی زیادہ سگرٹ پیتے ہیں، نہ باتیں کم کرتے ہیں، نہ سگرٹ کم پیتے ہیں۔

قینچی کے سگرٹوں کی کئی ڈبیاں میز پر دھری ہوئی تھیں۔ جن کی باری باری شامت آرہی تھی۔

ہماری آمد پر جب انھوں نے پہلا سگرٹ لیا تو از رہِ مذاق بلونت سنگھ کی طرف ڈبیا بڑھائی۔ بلونت سنگھ نے کہا ”مجھے پینے پر تو کوئی اعتراض نہیں لیکن اس وقت طبیعت نہیں چاہ رہی۔“

پھر میری طرف سگرٹوں کی ڈبیا بڑھا کر۔ ”لیجیے!“

”میں نہیں پیتا۔“

”اچھا! — اصلی سکھ لاہور سے —“

اس نامکمل فقرے نے مکمل فقرے سے زیادہ لطف دیا۔

ان کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ اپنے نظریات بڑا مل بیان رکھتے ہیں۔ بُری چیزوں کا جواز نکالتے رہتے ہیں۔ مثلاً امرد پرستی پر انھوں نے بڑا ریاض کیا ہے۔ اپنی اُلٹی سیدھی دلیلوں سے پورے جذب و انہماک کے ساتھ یقین دلانا چاہتے ہیں کہ یہ تو بڑے ثواب کا کام ہے۔

معاً ان کے ذہن میں ایک بات آئی اور مجھے قدرے ڈانٹ کے پوچھا۔

”اجی حضرت! آپ نے میرے خطوط کی اشاعت کے وقت امرد پرستی کے

متعلق جتنے جواز اور نکتے تھے، وہ کیوں کاٹ دیئے تھے؟"

"مجبوری تھی۔"

"کیا مجبوری تھی؟"

"اجتہاد کا حق ہمیں نہیں ہے۔"

بہت خوش ہوئے۔ "بھئی آؤ اس بات پر گلے مل لیں۔"

"گلے دلے ملنے کی بات چھوڑیئے مجھے یہ بتائیے کہ بعض اوقات آپ کا قلم اور ذہن قابو میں کیوں نہیں رہتا؟"

بگڑے، مگر مہمان سمجھ کر بے قابو نہ ہوئے۔ اس کے بعد جو انھوں نے امرد پرستی کے بارے میں دلائل دینے شروع کیے تو چپ ہونے میں نہ آئے۔ جو جو باتیں میں نے ان کے خطوط سے حذف کی تھیں وہ سب دہرائیں اور ان کے ساتھ اور بھی ایسی باتیں جو صرف سینہ بہ سینہ ہی چل سکتی ہیں۔

لیکن یہ وقت وہ تھا کہ جب وہ شراب کی بوتل سامنے رکھ کر اور پیہم مستفید ہو کر بول رہے تھے۔ اتنی نشے کی حالت میں بھی انھیں اتنا ہوش رہا کہ مجھے بڑی لجاجت سے کہا یہ باتیں OFF THE RECORD ہیں

شراب معمولی پی رہے تھے اور بہت سی پی رہے تھے۔ جب شام کا وقت ہوا تو انھوں نے کسی کا نام لے کر پکارا۔

وہ صاحب حاضر ہوئے تو اُن کا حلیہ یہ تھا۔ سر سے ننگے، پاؤں سے ننگے، قریباً آدھے جسم سے ننگے، صرف بنیان اور نیکر پہنے ہوئے۔ معلوم ہوا کہ یہ صاحب طالب علم

ہیں غریب ہیں۔ بغرضِ استفادہ اور بغرضِ شکم ان کے ہاں رہتے ہیں۔ ان کی آمد پر انھوں نے کہا

"بوتل لاؤ۔"

وہ صاحب بوتل اور پانی لے آئے۔ کوئی آدھی بوتل ہوگی۔

بوتل کو سامنے رکھ کر بے حد خوش ہوئے لیکن ہم دونوں پریشان ہو گئے اس لیے کہ اب ان کے پینے اور بہکنے کا وقت تھا۔ مندرجہ بالا باتیں اسی کیف و مستی کا نتیجہ ہی تو تھیں۔

پہلے تو انھوں نے وہ آدھی بوتل خالی کی۔ اس کے بعد دوسری بوتل منگوا کر پیتے رہے سرشار ہوتے رہے۔ جب ہم اٹھے ہیں تو وہ بھی ختم ہونے کے قریب ہی تھی۔

یہ اپنے مخالفین کے بڑے سخت نکتہ چین بلکہ دشمن ہیں۔ پہلے ان کی فہرست میں اثر لکھنوی تھے اب سردار جعفری کا بھی اضافہ ہو چکا ہے اور سردار جعفری کی مخالفت میں اتنا آگے بڑھ چکے ہیں کہ اب خود کو ترقی پسند کہتے ہوئے شرماتے ہیں۔ پہلے انھوں نے اثر لکھنوی کی شان میں دو ایک غزلیں فرما دی تھیں جن میں ان کی شاہکار یہ غزل تھی ؎

جیسی تنقید اثر لکھتے ہیں ویسی تو فراق
پھینک دیجے لکھ کے توفیق حماقت چاہیے

اب سردار جعفری کی شان میں جعفری ہی کے ردیف و قافیہ میں ایک لمبی غزل کہہ دی ہے جس کے چند ایک شعر ان کی زبان سے سُنے جو اب یاد نہیں۔ میں نے سُنا ہے

وہ غزل کسی رسالے میں چھپی بھی ہے۔

انتہا پسندی خود ان کی ذات میں بھی ہے لیکن کسی اور کو انتہا پسند ہوتے نہیں دیکھ سکتے۔ اُسی دن کہہ رہے تھے:

"ٹراٹسکی کو کیوں قتل کیا گیا؟"

"بیریا کو کیوں گولی ماری گئی؟"

"صرف نظربندی کیوں مناسب نہیں سمجھی گئی؟"

وہ سب کمیونسٹوں کی کئی جارحانہ باتوں پر شدید نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ اشتراکی نظام زندگی ہی کو پسند کرتے ہیں۔ لیکن وہ چاہتے ہیں اور ان الفاظ میں چاہتے ہیں کہ سردار جعفری ایسے ناپختہ ذہن کے لوگ ترقی پسند نہ ہوں۔ اب تو انھیں سردار جعفری کی پوری شاعری ہی بے مزہ معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ مجھے جنگجویانہ شاعری پسند نہیں۔

اس بات پر میں نے عرض کیا "ایسی تو کچھ نظمیں آپ کی بھی ہیں۔"

"اگر میری نظمیں سردار جعفری ایسی ہیں تو مجھ پہ لعنت ہو۔"

تحریری طور پر وہ اپنے آپ کو بہت کچھ سمجھتے ہیں۔ زبانی انکساری بھی برت لیتے ہیں۔ شکسپیر سے بے حد متاثر ہیں۔ غالب کے دیوان رکھتے ہیں۔ اقبال کو اردو کا سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں۔ میر کی گہرائی کے قائل ہیں۔ داغ کی سادگی پر سر دُھنتے ہیں۔ مومن کے [illegible] کے داری تان ہیں۔ سعدی اور حافظ کے پرستار ہیں۔

غرض یہ کہ جو چل بسے ہیں ان سے بے حد متاثر ہیں۔ جو زندہ ہیں انھیں ملنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

ہم لوگ مزے سے بیٹھے ہوئے تھے اور اچھی بھلی باتیں ہو رہی تھیں کہ ایک دم بغل میں بوتل دبا کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ اب جمنا کے کنارے چل کے بیٹھیں گے، وہیں پئیں گے، وہیں شعر و شاعری ہوگی۔

اس وقت رات کے کوئی دس بجے ہوں گے۔ اس لیے ہم دونوں ان کے اس فیصلے پر چکرا گئے۔

بلونت سنگھ نے مجھے اشارہ کیا کہ اس مصیبت سے نجات دلاؤ۔

میں نے بلونت سنگھ سے کہا: "آپ ان کے ساتھ جمنا کے کنارے چلے جائیں مجھے نیند آ رہی ہے۔ اس بیچ میں تو ہوش جاؤں گا۔"

بڑے معصوم بن کر کہنے لگے: "کیا کروں۔ یہ میرے استاد ہیں — خدا کے لیے میری جان چھڑاؤ۔"

اب یہ گستاخی میرے سپرد کی گئی تو میں نے فراق صاحب سے عرض کیا۔ ہم دونوں میں سے کوئی بھی اس وقت جمنا کے کنارے جانے کے لیے راضی نہیں۔ آپ اکیلے ہی ہو آئیں۔"

"اکیلے؟"

"جی ہاں!"

فراق صاحب جیسے غزل میں زیادہ سے زیادہ شعر کہنا چاہتے ہیں اسی طرح

زیادہ سے زیادہ روپوں کا لالچ بھی کرتے ہیں۔

فراق صاحب کی کچھ رقم مجھ پر واجب تھی۔ جسے کچھ دیر بھی ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب ہم ملاقات کی محفل برخاست ہونے لگی تو میں نے ان سے کہا "اسی ہفتے آپ کو روپے بھجوانے کی کوشش کروں گا۔"

یہ سنتے ہی وہ میری اس بات پر انگریزی میں خفا ہوگئے۔ کہنے لگے میں کوئی روپوں کا بھوکا ہوں۔ آپ نے اس وقت ایسی بات کرکے مجھے بڑا صدمہ پہنچایا ہے۔ بلکہ دوستی کی توہین کردی ہے

دوسرے دن صبح جب میں ان کے پاس یونیورسٹی پہنچا تو مجھ سے پوچھنے لگے۔

"رات وہ روپوں والی کیا بات تھی؟"

اب مجھے یہ بتا دیجئے کہ میرے اس غیر مکمل سے شخصی مطالعہ کا آپ پر کیا اثر ہوا؟ اگر آپ نے فراق صاحب کے بارے میں کوئی اچھی رائے قائم نہیں کی تو یہ ناکامی میری ہے۔ فراق صاحب کی رنگا رنگ —— دلآویز —— اور غیر معمولی شخصیت پر کوئی غلط اثر نہیں پڑنا چاہیے۔ جبکہ فراق صاحب شفیق استاد —— مخلص دوست —— ہمدرد انسان —— مشہور شاعر —— فاضل نقاد —— سبھی کچھ ہوں۔

عابد صاحب

جب میں نے سیّد عابد علی صاحب عابدؔ سے کہا۔ کہ میں آپ پر فلاں صاحب سے مضمون لکھوا رہا ہوں۔ تو سیّد صاحب نے فرمایا ـــــ " یہ مجھ پر ظلم ہوگا۔"

اپنی طرف سے میں نے بڑے صحیح لکھنے والے کا انتخاب کیا تھا۔ ادب میں اُن کا بڑا مقام ہے۔ سیّد صاحب سے اُن کے صرف دیرینہ ہی نہیں بلکہ دوستانہ تعلّقات! یہی وجہ تھی کہ میں نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔ " تو پھر آپ پر کس سے مضمون لکھواؤں؟ "

میرا خیال تھا کہ جواب میں اب مجھے یہ سننا پڑے گا۔ مجھ پر ابو الکلام سے لکھواؤ۔ یا ڈاکٹر عبدالحق سے، لیکن انھوں نے جو جواب دیا۔ وہ میری توقعات کے بالکل برعکس تھا۔ فرمایا، " اوّل تو مجھ پر مضمون چھاپنے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر چھاپنا ہی چاہتے ہو تو خود لکھو۔"

میں اِس جواب پر بوکھلا سا گیا۔ اس لیے کہ ان کے قریباً تمام بڑی بڑی ادبی شخصیتوں سے برادرانہ تعلّقات تھے اور وہ مضمون کے لیے منتخب مجھے کر رہے

تھے۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے خیال آیا کہ یہ یا تو مجھے بنا رہے ہیں یا شدید بیماری کی وجہ سے ان کی قوتِ فیصلہ جواب دے چکی ہے۔

دونوں صورتیں میرے لیے تکلیف دہ تھیں۔ لیکن انھوں نے مجھے اسی وقت بہ خلوصِ تمام یہ یقین دلا دیا کہ میں یہ فرمائش بہ قائمیٔ ہوش و حواس کر رہا ہوں۔ اور اس کے بعد جو انھوں نے میری اسکیچ نگاری کی تعریفیں کیں۔ وہ میں آپ سے کیا کہوں۔ اگر ان میں سے کوئی بات میرے نزدیک بھی سچّی ہوتی۔ تو یہاں لکھ دیتا ایک شرمندگی کا احساس اُس وقت بھی تھا۔ اور اس وقت بھی ہے۔

اگر ان پر کوئی اور مضمون لکھتا۔ تو بقول سیّد صاحب ان پر ظلم ہوتا۔ اب وہ ظلم مجھ پر ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ میں سمجھتا ہوں کہ ان کی رنگا رنگ شخصیت کو قلم کے سحر سے کاغذ پر نہ لا سکوں گا۔ اسی احساس سے اس مضمون کو شروع کر رہا ہوں۔

میں نے سیّد صاحب کو کئی ادبی محفلوں میں دیکھا اور سُنا تھا۔ اور یہ بھی علم تھا کہ یہ دیال سنگھ کالج کے پرنسپل ہیں ـــــ بڑے وجیہہ، خوش شکل، خوش پوشاک اور خوش آواز لیکن میرا ان سے کوئی باقاعدہ تعارف نہ تھا۔ جی بھی چاہتا تھا کہ ان سے راہ و رسم بڑھے۔ لیکن تعارف کا کوئی آبرومندانہ موقعہ ہی نہیں ملا تھا۔ خواہ مخواہ کے تعارف کے لیے میرا دل کبھی راضی نہیں ہوا۔ ورنہ تعارف کا یہ طریقہ بڑا آسان تھا کہ وہ کسی مشاعرے سے شعر پڑھ کر نکلتے، اور میں سلام جھاڑ کر ان کے دو چار شعروں کی تعریف میں زمین آسمان

کے قلابے ملا دیتا، اور تعارف ہو جاتا۔

شاعر بیچارے کی یہ بڑی کمزوری ہے کہ اُسے روٹی نہ ملے تو گزارہ کر لیتا ہے لیکن شعروں کی داد نہ ملے تو جیتے جی مر جاتا ہے اور جب بلا وجہ داد ملے تو تعارف چھوڑ دوستیاں تک ہو جاتی ہیں۔

دوسری جھجک ایک اور بھی تھی وہ یہ کہ مجھے اب تک پرنسپلوں سے ملتے ڈر لگتا ہے میرے ایک اور کرمفرما بھی ایک کالج کے پرنسپل ہیں اُن سے بھی مجھے ملتے ہوئے ڈر ہی لگتا ہے۔ حالانکہ وہ بڑے نیک اور نستعلیق قسم کے بزرگ ہیں میرے تو ذہن میں یہ بات گھُسی ہوئی ہے کہ سب کے سب پرنسپل ہر ایک سے طالب علم ہی سمجھ کر پیش آتے ہیں حالانکہ اس طالب علم کے ساتھ کبھی کسی پرنسپل نے طالب علم سمجھ کر رو کھائی سے بات نہیں کی۔

آخر ایک موقع ایسا آیا کہ مجھے سید صاحب کی ضرورت پڑ گئی۔ اور میں تمام آبرومندانہ تعارف کے آداب بھول کر انھیں خط لکھنے بیٹھ گیا۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے۔ جب میں نقوش کی ادارتی ذمہ داریوں میں نیا نیا پھنسا تھا۔ اور مجھے اس گھٹیا منصب کے اسرار و رموز اور نزاکتوں کا قطعی احساس نہ تھا۔ مجھے یہ بھی علم نہ تھا کہ اس باب میں میری کون مدد کرے گا اور کون ٹانگ گھسیٹے گا۔

مدیرانہ فرائض کو میں نے گھٹیا منصب اس لیے کہا ہے کہ آج کوئی بھی خوددار انسان کسی اچھے رسالے کا مدیر نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ بیشتر لکھنے والے پارٹی بازیوں کا شکار ہیں۔ (ادب اور پارٹی بازی! سبحان اللہ) خدانخواستہ کوئی مدیر اگر کسی لکھنے والے

سے سلام دعا کرتا ہوا پکڑا جائے۔ تو سمجھ لیجئے، اُس ادیب کے جتنے مخالف ہیں وہ سب دفعتہً مدیر کے حصے میں آ گئے۔

نقوش کی ادارت سے پہلے میں بہت اترایا کرتا تھا کہ میرے تمام لکھنے والوں سے دوستانہ اور برادرانہ تعلقات ہیں لیکن آج اس دعوے پر خود شرمسار ہوں۔ اوہ! ــــ میں نے خواہ مخواہ یہ تکلیف دہ مسئلہ چھیڑ دیا۔ عرض یہ کرنا تھا کہ میں اپنے ہاں کے ادبی ماحول کی نزاکتوں سے کچھ بیگانہ ہی تھا۔ بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے ڈاکٹر تاثیر (مرحوم) اور عابد صاحب کو خط لکھے کہ میں بعض معاملات میں آپ سے مشورہ لینا چاہتا ہوں۔

ان حضرات کو میں نے یہ اہمیت اس لیے دی تھی کہ یہی حضرات یہاں کے ادبی ماحول کے باوا آدم تھے۔ تاثیر صاحب نے خط کا جواب ہی نہ دیا۔ عابد صاحب نے فوراً لکھا "آپ جب آنا چاہیں، تشریف لائیں۔ میں آپ سے ہر وقت ملنے کو تیار ہوں۔"

یہاں اگر میں نے تاثیر صاحب کا ذکر یونہی چھوڑ دیا، تو شاید میں مرحوم کے ساتھ انصاف نہیں کروں گا۔ اس لیے کہ میرے خط لکھنے کے کوئی ڈیڑھ ماہ بعد اُن کا یہ پیغام آیا تھا کہ "آپ نے بڑا اچھا کیا کہ ترقی پسندوں کے چنگل سے نکلے۔ اور اب امید ہے کہ آپ خالصتاً ادبی اقدار کے ماتحت پرچہ نکالیں گے۔ اگر اس سلسلے میں میری خدمات کی ضرورت ہو تو وہ بلا معاوضہ حاضر ہیں ــــ کسی دن گھر پہ آیئے۔ تاکہ کچھ کھانے پینے کا شغل بھی رہے۔"

جو صاحب یہ پیغام لائے تھے۔ میں نے ان سے ڈاکٹر صاحب کی ان عنایات کا شکریہ ادا کرکے یہ عرض کیا تھا کہ نوبت صرف کھانے تک ہی رہے۔

وہ صاحب تو ہنستے ہنستے چلے گئے۔ لیکن میں اُن کے ہاں نہ جا سکا۔ ایک تو یوں کہ اس واقعہ کے کچھ ہی دنوں کے بعد اُن کا اچانک انتقال ہو گیا۔ دوسرے مجھے یہ وہم ہونے لگا تھا کہ ممکن ہے تاثیر صاحب جو مشورہ دیں' وہ میرے لیے قابلِ قبول نہ ہو۔ میں جب بھی اُن کے ہاں جانے کے لیے تیار ہوتا تھا۔ تو مجھے اُن کا یہ فقرہ یاد آجاتا تھا "آپ نے بڑا اچھا کیا کہ ترقی پسندوں کے چنگل سے نکلے" اور یہ فقرہ مجھے یاد اس لیے آجاتا تھا کہ بعض اختلافی امور کے باوجود میں یہ سمجھتا تھا کہ آج بھی جو ہمارے ادب میں بہار اور تازگی سی ہے۔ وہ کچھ انہی "سر پھروں" کی رہینِ منت ہے۔ ورنہ ادب ایک ہی ڈگر پر چل چل کر اپنی ساری دلکشی کھو بیٹھتا ــــ

اگر مجھے علم ہوتا کہ اُن کا یوں انتقال ہو جائے گا۔ تو میں اپنے تمام خطروں کو بالائے طاق رکھ کر اُن سے ضرور ملتا۔ افسوس کہ مجھے اُن کے جنازہ میں شریک ہونے کا موقع تو ملا۔ لیکن اُن سے ہم کلام ہونے کی نوبت نہ آئی۔

عابد صاحب کے متعلق میں نے یہ سن رکھا تھا کہ وہ دل کے بڑے کھرے ہیں۔ دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ اس لیے ان کی اس تعریف کو حسبِ حال پا کر ان سے ملنا ضروری سمجھا۔

جب میں نے انھیں قریب سے دیکھا۔ تو مندرجہ بالا فقرے میں اختلاف پایا۔ یہ دشمنوں کے پکّے دشمن اور دوستوں کے دوست نکلے۔ اگر طبعاً جذباتی نہ ہوتے تو

دوستوں کے پکے دوست بھی ہوتے ۔

آناً فاناً ناراض ہو جاتے ہیں اور چشمِ زدن میں راضی بھی ہو جاتے ہیں بعض اوقات ناراضی دشمنی کی حدود تک جا پہنچتی ہے ۔ اگر غلط فہمی دور ہو جائے ۔ تو وہی یاری ہوگی ۔ وہی مزے مزے کی حکایتیں ہوں گی ۔ اور وہ تمام گفتہ اور ناگفتہ باتیں ہونگی ۔ جو صرف آپ کو انہی میں ملیں گی ۔ اِس لیے کہ ان میں جھوٹا تقدس نام کو نہیں ۔ یہ اتنے اوریجنل ہیں کہ اپنی اوریجنلٹی میں نقطۂ آخر پر ہیں ۔ یوں تو یہ بعضوں کو بڑے مغرور اور خودسر معلوم ہوتے ہیں لیکن واقعہ اس کے برعکس ہے ۔ جنھوں نے انھیں دور سے دیکھا ۔ اُن کے لیے یہ مغرور اور خودسر ہیں ۔ جو ان کے قریب آکے بیٹھ گئے ۔ وہ ان کے خلوص اور برابری کی اپنایت کو محسوس کرنے لگے ۔

یقین کر لیجئے ایسے لوگ اب خال خال ہی رہ گئے ہیں جو دنیا کے ہر موضوع پر بھی تُلی باتیں کر سکتے ہوں ۔ اردو ادب کے تمام پہلوؤں پر یوں بولتے چلے جاتے ہیں ۔ جیسے سب کچھ ازبر ہو ۔ فارسی بھی اُردو ہی کی طرح ان کی اپنی زبان معلوم ہوتی ہے ۔ اس پر ان کا لہجہ اور الفاظ کے صحیح چناؤ کے ساتھ معاملے کی تہ تک مخاطب کو پہنچا دینا ۔ ہر کسی کو کہاں نصیب ہوتا ہے ۔

میں نے ان سے کبھی بحث ہی نہیں کی ۔ اس لیے کہ بحث بھی ایک فن ہے جو ریاضت ہی سے آتا ہے ۔ پھر بھی کسی بات پر لقمہ دے کر وہ وہ لطف اندوز ہوا ہوں کہ کچھ نہ پوچھیے ۔ بسا اوقات ان سے باتیں کرنے کے بعد مجھ پر ایک سرشاری کی سی کیفیت طاری ہو گئی ۔

میری ان سے پہلی باقاعدہ ملاقات غالباً ۱۹۵۱ء میں ہوئی تھی۔
لیکن میں آپ کو اس سے پہلے کے حالات بھی بتاؤں گا۔ تاکہ آپ کو یقین آسکے کہ ان میں سے کوئی بات بھی سچی نہیں۔ اگر ان میں کوئی بات سچی نکل آئے تو اس میں میرا کوئی اعجاز نہ ہوگا۔ بلکہ یہ سمجھ لیجئے گا کہ میں نے یہ باتیں مستعار لی تھیں۔ جو یہ مضمون لکھنے کے بعد سب کو نام بہ نام لوٹانی ہوں گی۔
یہاں ایک بات تو یہ سمجھ میں آتی ہے کہ سرے سے اُن حکایتوں ہی کو نہ دہراؤں جن پر پرائے مال کا شبہ تک ہو۔ بہت ممکن ہے کل کلاں کو سب یہ کہدیں کہ ہم نے فلاں بات یوں تو نہیں بتائی تھی۔ بلکہ یوں بتائی تھی۔ اس اعتبار سے میں اپنی جھوٹی باتوں کو دوسروں کی سچی باتوں پر یوں ترجیح دینا چاہتا ہوں کہ جو کچھ اپنا مشاہدہ ہے صرف اُسی پر اکتفا کروں۔ تاکہ سینہ تان کر یہ کہہ سکوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ وہ میرا مشاہدہ ہے۔ اگر میں نے اپنے مشاہدے کے سلسلے میں کہیں ٹھوکر کھائی ہو تو اس کی معذرت قارئین سے چاہوں گا اور عابد صاحب سے بھی۔
کل ہی کا ذکر ہے کہ جب میں نے ریڈیو کا بٹن گھمایا۔ تو چھوٹتے ہی سید صاحب کی فنِ موسیقی پر تقریر سننے میں آئی۔ عرصہ ہوا۔ ان کا اسی موضوع پر ایک مقالہ پہلے بھی یونیورسٹی ہال میں سُن چکا تھا اور میں نے اس مقالے کے دَوران میں جمائیاں لے لے کر اپنا ستیاناس کر لیا تھا۔
مجھے سرے سے موسیقی ہی سے کوئی دلچسپی نہیں۔ فنِ موسیقی سے خاک ہوتی۔ کل پھر جو ان کی اسی موضوع پر تقریر سُنی، تو وہی پرانا نقشہ آنکھوں کے سامنے ایک بار

پھر گھوم گیا۔ سوچتا ہوں کہ اب تو ان کی خاطر ان کی ساری تقریریں سننی پڑیں گی۔ خواہ وہ بھیڑ بکریاں پالنے کے متعلق ہی کیوں نہ ہوں۔ بُرا ہو تعلقِ خاطر کا۔

آج سے بارہ تیرہ برس پہلے میں نے ان کا پیرالوئی کی الفراڈائٹ کا ترجمہ "داستان" کے نام سے پڑھا تھا۔ اور بے حد متاثر ہوا تھا۔ اور اسی وقت یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا مترجم کوئی بڑا زندہ دل قسم کا انسان ہوگا جس نے اس انداز کی رنگین کتاب کا ترجمہ اسی ٹھاٹھ سے کیا۔ اگر وہ کتاب فرانسیسی ادب میں بڑا نمایاں مقام رکھتی ہے۔ تو انھوں نے اُس کا ترجمہ بھی اس شان سے کیا کہ میں نے اُردو میں اس پائے کے ترجمے نہیں دیکھے۔

مجھے ان سے یہ شکایت رہی ہے کہ اتنی ٹھوس علمی شخصیت ہونے کے باوجود انھوں نے اب تک کوئی قابلِ ذکر ادبی کام نہیں کیا۔ یہ "فضیلت" صرف انھی میں نہیں بلکہ یہاں کی اور بھی کئی بڑی بڑی شخصیتوں میں بھی اور ہے۔ اگر میں اس سلسلے میں ڈاکٹر تاثیر (بعض زندہ کرمفرماؤں کا نام لیتے ہوئے ڈر لگتا ہے) کا نام لوں تو میرے دوست مجھے معاف فرمائیں گے۔ اس لیے کہ یہاں تو میں نے اپنے اُس دُکھ کا اظہار کیا ہے۔ جو مجھے ان حضرات کی ادب سے بے توجہی برتنے کے سلسلے میں ہوا ہے۔ اس کی وجہ کچھ ہوں۔ بہرحال یہ لوگ اگر سنجیدگی سے اُردو ادب کے لیے کچھ کرنا چاہتے۔ تو اردو ادب اپنے ان محسنوں کو کبھی نہ بھولتا۔ دیکھیے آج تاثیر ہم میں موجود نہیں ہیں اور ان کی کوئی ایسی معرکے کی تصنیف بھی موجود نہیں ہے جو تاثیر کو صدیوں زندہ رکھ سکے۔ اگر وہ پوری یکسوئی کے ساتھ کچھ لکھ جاتے۔ تو یقین کیجیے۔ ان کی لکھی ہوئی چیزیں کبھی نہیں مر سکتی تھیں۔ خدانخواستہ اگر آج عابد صاحب بھی ہم میں سے اُٹھ جائیں تو لوگ انھیں

کے برس تک یاد رکھیں گے؟ اور ان کے علم و فضل سے لوگوں کو کتنا فیض پہنچا؟ ان کے پاس بیٹھئے تو یہ علم و فضل کے خزانے کھول کے رکھ دیں گے۔ اور جب ہم ان چیزوں کو کتابی صورت میں ڈھونڈھنا چاہیں گے تو ہمیں مایوسی ہوتی ہے۔

آجکل اس کمی کا احساس عابد صاحب کو بھی ہوا ہے۔ وہ احساس غالباً اس لیے بھی ہے کہ یہ بہت بیمار رہے ہیں اور ہیں۔ سوچتے ہوں گے ،اگر یونہی چل بستے، تو کیا ہوتا بہت ممکن ہے وہ اب صحت یاب ہونے پر کچھ کریں۔ میں تو ان کی زندگی کی دعا صرف اسی لیے مانگتا رہتا ہوں۔

یہاں لطیفے کی ایک بات یہ بھی سن لیں۔

یہ مجھ سے اکثر کہا کرتے ہیں "طفیل تم جو اپنی تمام صلاحیتیں اور روپیہ نقوش کے یہ گرانڈیل نمبر چھاپ کر ضائع کیا کرتے ہو۔ اسے فی الفور ختم کر دو۔ اور کوئی ایسا کام کرو۔ جو تمھیں زندہ جاوید بنا دے۔ مثلاً چار ہزار صفحوں کی تاریخ ادب اردو چھاپو۔ تمام بڑے بڑے شعرا پہ بڑے معرکے کے مضامین کوئی دو ہزار صفحوں پہ چھاپو۔ تمام مثنویوں کو ایڈٹ کر کے یا کرا کے انھیں بسیط مقدمات کے ساتھ ایک جگہ چھاپو، اور یہ بھی بتاؤ کہ ان مثنویوں کا تاریخی پس منظر یہ تھا۔ یہ تم کیا کر رہے ہو کہ ہر مہینے اتنا لحیم شحیم نمبر چھاپ دیتے ہو۔ خدارا کوئی کام کرو" ــــ عابد صاحب نے مجھ سے جو کچھ کہا۔ میں وہ سب کرنے کی کوشش کروں گا (خدا مجھے اس کی توفیق بھی دے) لیکن میں بھی ان سے یہ کہتا ہوں ــــ خدارا کوئی کام کریں[1]!

یوں تو انھوں نے کئی مشاعروں اور ادبی نشستوں کی صدارت کی ہوگی لیکن

---

[1] اس کتاب کے پہلے ایڈیشن کے وقت تک عابد صاحب سے میری یہ شکایت تھی۔ مگر آج نہیں۔

ایک مرتبہ جو انھوں نے ایک مشاعرے کی صدارت کی تو مزا ہی آ گیا۔ اُس مشاعرے میں بڑے بڑے اساتذہ کے ساتھ ایک نئی اُبھرتی ہوئی شاعرہ کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ جو بلاشبہ اس وقت اور اس عمر میں بھی اچھے شعر کہتی تھیں۔ اس پر مستزاد اُن کا ترنم، چند ہی روز پہلے وہ لاہور ہی میں پڑھ کر اتنی داد وصول کر چکی تھیں کہ آج غالب بھی زندہ ہو کر آ جاتے۔ تو انھیں بھی اتنی داد نصیب نہ ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ ہال کے باہر یا علی کے نعرے لگ رہے تھے۔ ہجوم نے ہال کے تمام شیشے توڑ ڈالے۔ حتیٰ کہ دروازوں کی چولیں تک چوں چوں کرنے لگیں۔ جب عابد صاحب نے یہ صورتِ حال دیکھی تو انھوں نے منتظمین کی حالتِ زار کا اندازہ کیے بغیر شہنشاہِ جہانگیر کے سے انداز میں فرمایا (جو میں نے پکار نامی فلم میں دیکھا تھا) "ہال کے تمام دروازے کھول دیے جائیں"۔ جب اس پر بھی کارکن ٹس سے مس نہ ہوئے۔ تو کرسیِ صدارت سے ایک بار پھر اعلان ہوا۔ "میں کہتا ہوں تمام دروازے کھول دیے جائیں"۔ چنانچہ تمام دروازے کھول دیے گئے۔ چونکہ بیشتر لوگ بلا ٹکٹ آئے تھے۔ اس لیے اس موڈ میں تھے کہ سب کو ہوٹ کریں گے۔ بڑے بڑے شاعر ہوٹ ہوئے لیکن جب محترمہ کی باری آئی تو انھیں متوقع داد ملی۔ اُن کے بعد چند ایک اساتذہ کرام کو محض احتراماً سُن کر پھر یہ اصرار کہ محترمہ ہی پڑھیں۔ اُس وقت ماحول ایسا تھا کہ ایک دَور اور ہوتا۔ لیکن لوگوں کے بے جا بڑھتے ہوئے اصرار نے عابد صاحب سے یہ کہلوا دیا کہ اگر آپ لوگ ایسے ایسے اساتذہ کے بعد بھی محترمہ ہی کے کلام کی فرمائش کریں گے۔ تو میں مشاعرہ برخاست کر دوں گا۔ جب اس دھمکی پر بھی سامعین کا مطالبہ جوں کا توں رہا تو ان کی طرف سے مشاعرہ ختم ہونے

کے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہی یہ اعلان کر دیا گیا کہ میں مشاعرے کے برخاست ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔

مشاعرے کے دو تین روز بعد جب میری سید صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے خود اُس مشاعرے کا ذکر کیا اور کہا: "بچی بے شک اچھے شعر پڑھتی اور کہتی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم سامعین کو اس کی اجازت دے دیں کہ وہ اساتذہ کی تذلیل پر اُتر آئیں۔"

اسی طرح کا ایک واقعہ اور بھی ہے۔

میرے ایک کرمفرما دوست نے عابد صاحب کی صدارت میں ایک مشاعرہ اور کرایا تھا۔ اور میری یہ ڈیوٹی لگا دی کہ گیٹ پر کھڑا رہوں تا کہ جو شاعر ایک بار ہال میں آ جائے۔ وہ باہر نہ نکلنے پائے۔ ابھی مشاعرہ شروع ہی ہوا تھا کہ ایک صاحب بھاگے ہوئے آئے اور کہا: "یار! عابد صاحب تو مشاعرہ ختم کرنے والے ہیں۔" یاد رکھیے کہ ابھی مشاعرہ شروع ہوئے پون گھنٹہ ہی ہوا تھا۔ میں بھی اس صورتِ حال سے گھبرا سا گیا۔ چنانچہ ایک چھوٹا سا پُرزہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا کہ "اس مشاعرے کو ذرا اور چلائیے، تا کہ مشاعرہ مشاعری بن کر نہ رہ جائے۔ اور اگر آپ کو جلدی ہو تو اپنا قائم مقام صدر شوکت صاحب کو بنا دیں۔"

میں نے محسوس کیا کہ میری اس بے جا مداخلت پر بڑے جھنجلائے۔ لیکن انھیں میری خاطر منظور تھی۔ اِس لیے بادلِ نخواستہ اعلان کر دیا۔ "چونکہ مجھے جلدی ہے۔ اس لیے میں شوکت تھانوی صاحب سے کہوں گا کہ وہ کرسئ صدارت پر براجمان ہوں۔

اِس پون گھنٹے کی صدارت میں بات صرف اِتنی ہوئی تھی کہ شاعر شعر پڑھ رہا تھا اور سامعین میں سے کچھ شی، شی کر رہے تھے اور کچھ مرغوں کی طرح اذانیں دے رہے تھے۔

اس کے بعد شوکت صاحب نے کچھ سامعین کے ساتھ مل کر اور کچھ انھیں اپنے ساتھ ملا کر مشاعرے کو اس انداز سے چلایا کہ خاصا کامیاب رہا۔

عابد صاحب کی خدمت میں میری گزارش یہ ہے کہ وہ کسی مشاعرے کی صدارت نہ کیا کریں۔ اس لیے کہ وہ اس دور میں بھی مہذب اور باسلیقہ سامعین کی توقع لے کر آتے ہیں اور جب ماحول اس کے برعکس پاتے ہیں تو پرنسپل بن جاتے ہیں۔

ان کی زندگی میں چند ایک واقعات ایسے بھی آئے۔ جنھوں نے ان کی زندگی کے رُخ ہی کو موڑ دیا۔ ان میں ایک دُوسری شادی کا قصہ ہے اور ایک کالج کے ٹرسٹ سے تنازعہ۔ ان دونوں جھگڑوں کا معاملہ عدالت کے رُوبرو ہے! اس لیے اس پر اپنی طرف سے کسی قسم کا اظہارِ خیال کرنا مناسب نہ ہوگا۔ پھر بھی وہ باتیں کہہ لینے میں کچھ ہرج نہیں ہے۔ جب بے نذر ہوں۔ میرا خیال ہے کہ شادی کے معاملات کو بالکل نہ چھیڑا جائے۔ اس لیے کہ وہ دل کے معاملات تھے۔ جواب عدالت کے معاملات بن گئے ہیں۔

کالج کے ٹرسٹیوں سے جب یہ جھگڑا چلا۔ تو یہ اختلاجِ قلب میں بُری طرح مبتلا تھے۔ حالات یکسر ان کے خلاف تھے۔ اور یہ خود اتنے بیمار تھے کہ زندگی اور موت میں صرف دو چار ہی قدم کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ انھیں پہروں اپنا ہوش نہ رہا لیکن

اُن دنوں بھی ان کے دم خم دیکھنے والے تھے۔ ذرا بھی تو پریشان نہ تھے۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا۔ تو وہ مرنے سے پہلے ہی مر جاتا۔ لیکن یہ صرف انہی پریشانیوں کی وجہ سے نہ مر سکے۔

ویسے آج کل یہ بھی کہتے رہتے ہیں کہ مرنے والا ہوں۔ فلاں کتاب کا ڈھانچہ ذہن میں ہے۔ فلاں کام کرنا ہے۔ چاہتا ہوں کہ مرنے سے پہلے کر جاؤں۔ لہذا تم وعدہ کرو کہ میرے مرنے کے بعد میرے تمام مضامین اکٹھے کرو گے اور چھاپو گے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مر جائیں۔ لیکن جو کام یہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور جسے شاید ان سے بہتر کوئی نہ کر سکے۔ وہ اگر کر گئے۔ تو کوئی لاکھ زور لگا لے۔ یہ کبھی نہیں مریں گے۔ اور اب بھی مجھے ان کی موت میں کچھ شک ہی ہو چلا ہے۔

یوں تو یہ شیعہ ہیں۔ لیکن ذرا یونہی سے، بیٹھے بیٹھے اپنے شیعہ دوستوں سے پوچھیں گے کہ بھئی سناؤ۔ تبرّہ کے قائل ہو یا نہیں؟ اگر وہ انکار کرے تو یہ کہیں گے۔ تو پھر آپ کیسے شیعہ ہیں؟ صحیح قسم کا شیعہ تو وہ ہے، جو تبرّے کو اپنا ایمان سمجھتا ہو۔ اگر کوئی شامتِ اعمال سے یہ کہہ دے کہ ہاں میں تو تبرّے کا قائل ہوں۔ تو سُنّی دوستوں سے مخاطب ہو کر فرمائیں گے بھئی، یہ لعین (اور لعین کا لفظ بڑے پیار میں کہیں گے) حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ، حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گالیاں دیتا ہے۔ اور اسے شرم نہیں آتی۔ بھلا سوچو تو گالی دینا بھی کوئی اچھا کام ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ہاں تنگ نظری کو کوئی دخل نہیں۔ ایسے ایسے نازک معاملات میں بھی دل لگی سے باز نہیں آتے۔

ایک بار اُنھوں نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے سُنا ہے۔ کل رات فلاں مجتہد صاحب امام حسینؑ کی سیرت پر روشنی ڈال رہے تھے اور مجمع زار و قطار رو رہا تھا کہ مجتہد صاحب نے ایک دم رُک کر یہ فرمایا۔ حضرات قبل اس کے کہ میں حضرت امام حسین کی سیرت پر مزید روشنی ڈالوں۔ آپ ایک خوشخبری سُن لیں کہ پاکستان کرکٹ کا میچ جیت گیا ہے۔

اس لطیفے پر حاضرین کا ہنستے ہنستے وہ بُرا حال ہوا ہے کہ سماں دیکھنے ہی والا تھا۔

یہ بلا کے زندہ دل ہیں۔ لسان ایسے کہ بڑے بڑے ان کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔

یہ ذہنی طور پر گنجلک قسم کے انسان نہیں۔ بلکہ بڑے صاف ذہن کے مالک ہیں۔ جذباتی ضرور ہیں۔ وہ بھی اس حد تک کہ منٹ میں راضی اور منٹ میں ناراض۔

بڑوں کو یہ کچھ نہیں سمجھتے۔ لیکن بچوں کو اپنا مشیر بھی بنا لیتے ہیں۔ باتیں بڑے تیقن کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور بچہ سمجھ کر چھوٹے بڑوں کی باتیں سنتے ہیں۔ ایک دم ہر ایک پر اعتماد کر لیتے ہیں۔ لیکن خود سروں کے سامنے ڈٹ جاتے ہیں۔

ہنگامہ آرائی ان کی طبیعت کا خاصہ ہے۔ ہر دَور میں کسی نہ کسی ہنگامہ کی سرپرستی کرتے ہی رہے ہیں۔ یہ بھی ایک طرح سے ان کی طبیعت کے کھرے پن کی نشانی ہے کہ جس چیز کو حق پر سمجھا اس کی حمایت میں سر دھڑ کی بازی لگا دی۔ اور جس بات کو غلط سمجھا اسے زندگی اور موت کا سوال بنا ڈالا ــــ عابد صاحب نے زندگی کی تمام ناکامیوں اور تمام الجھنوں کا اس پامردی سے مقابلہ کیا ہے کہ مجھے ان پر رشک آیا ہے۔

انھوں نے اپنی خوشیوں اور مسرتوں کو جب اپنے ہاں سے خود دھتکارا ہے تو افسوس بھی ہوا ہے۔

اِحسان صاحب

میرے ہاتھ میں بھی قلم ہے۔ جس سے میں نے بڑے بڑے لکھنے والوں کے بخئے ادھیڑ دیئے ہیں۔ اگر طفیل نے کوئی ایسی ویسی بات لکھ دی تو اس سے بھی نپٹ لوں گا۔

لیجئے مضمون آپ پڑھیں گے۔ بخئے میرے ادھیڑے جائیں گے لیکن مجھے اس کا کچھ زیادہ غم نہیں ہے۔ اس لیے کہ احسان صاحب میرے متعلق جو کچھ لکھیں گے وہ غلط تھوڑی ہوگا۔ میں بھی تو ان کے متعلق جو کچھ لکھنے والا ہوں وہ غلط نہیں ہے۔ یہ واقعہ بھی مجھے اس لیے لکھنا پڑا کہ ان کی شخصیت کو سمجھنے کے لیے اس کا اظہار ضروری تھا۔

۱۹۳۶ء کی بات ہے۔

میں نے ایک صاحب کو (وہ صاحب یہی احسان صاحب ہیں) کتابوں کی

ایک دکان پر چوخانہ تہبند باندھے، کھدر کا شلوکا پہنے، اپنے نیم گھٹے ہوئے سر اور "سخت سیاہ" قسم کے رنگ کے ساتھ بیٹھے دیکھا تھا۔

معلوم ہوا کہ یہ صاحب اُس دکان پر ملازم ہیں۔

زمانے کا اُلٹ پھیر دیکھئے کہ یہ اب اُسی شکل وصورت اور اُسی شاندار حلیئے کے ساتھ میرے پڑوسی ہیں۔ نہ جانے یہ کیا بات ہے کہ یہ اب مجھے پہلے کی طرح، اتنے بُرے نہیں لگتے۔ بلکہ اُن کے اس حلیئے اور اس شکل وصورت میں بھی ایک انفرادیت سی معلوم ہوتی ہے۔

پہلے ان کی زیارت دُور سے ہوا کرتی تھی۔ اب چھ برس کا اُٹھنا بیٹھنا بھی ہے۔ "حق پڑوسیت" ہی شاید میرے اس جُرم کی دلیل بن رہی ہے کہ ان پر دو حرف لکھنے بیٹھ گیا ہوں۔ دل میں ایک دھڑکا ہے۔ جس کی وجہ پہلے بیان کر چکا ہوں۔

باقاعدہ تعلیم چوتھی جماعت تک اور بے قاعدہ اتنی کہ ایم اے پاس کو بھی پڑھا دیں۔

ان کے والد مزدوری کرتے تھے اور زندہ رہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس برخوردار کے لیے بھی یہی کام مناسب سمجھا۔ تاکہ یہ بھی انہی کی طرح اینٹیں اور گارا ڈھو ڈھو کر اپنے مستقبل پر ایک دیوار چُن دیں۔ طوعاً و کرہاً یا بہ رضا و رغبت انھوں نے بھی اپنی عمر کے کئی جواں سال اُسی گارا اینٹ کی نذر کر دیئے۔ مگر یہ اپنی جد وجہد اور صلاحیتوں سے اُس چُنی ہوئی دیوار کو ڈھا کر آگے بڑھ گئے۔

مزدوری کے ساتھ ساتھ انھیں ایک لپکا اور بھی تھا۔

دن ڈھلے، جب مزدوری سے فارغ ہوتے تو منہ ہاتھ کو خوب دیسی صابن سے دھوتے اور اپنی طرف سے بن سنور کر، ایک پنواڑی کی دکان پر بیٹھ کر، مثنوی میر حسن، فسانۂ آزاد، نل دمن، قصہ حاتم طائی بآوازِ بلند پڑھ پڑھ کر لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ اور لوگ اس بدصورت شخص کی خوبصورت آواز پر مرنے کی کوشش کرتے ــــ ان کے مطالعہ میں آج بھی حجۃ اللہ البالغہ اور کیمیائے سعادت ایسی کتابیں ہی ہونگی۔ لیکن جب یہ یاروں میں بیٹھتے ہیں تو دنیا جہان کے علمی و ادبی مسائل کے ساتھ ساتھ پریم شاستر اور کام شاستر ایسی باتیں بھی بڑے خضوع و خشوع کے ساتھ بیان کرتے چلے جاتے ہیں۔

شاعروں کی باتوں پر اگر آپ کو یقین آجاتا ہو تو یہ خبر میرے لیے خوشی کا باعث ہوسکتی ہے۔ مجھے تو اکثر شاعر دوستوں کی باتوں میں شاعری زیادہ اور حقیقت منہ ڈھانپے ہی نظر آتی ہے۔ اس لیے کہ یہ کبھی تو ذہن کی سیڑھیوں سے آسمان پر چڑھ جاتے ہیں اور کبھی چپکے سے اُتر کر زمین پر آجاتے ہیں۔

ایک دن احسان صاحب نے، اپنی تمام شاعرانہ اُڑانوں کے ساتھ، مجھے اپنے بچپن کا یہ قصہ سنایا:۔

"ایک للّو نامی لڑکا میرا ہم مکتب تھا۔ جسے میں ہر روز گھر سے اسکول لے کر جایا کرتا تھا۔ راستے میں شمی کا مکان آتا تھا۔ یہ ایک طوائف کی لڑکی تھی۔ کلی کی طرح خوشرنگ، شربتی آنکھیں، ستواں ناک چھریرا بدن، جب وہ بولتی تو ایسا معلوم ہوتا کہ کوئی بانسری ہواؤں سے

بج رہی ہے۔ میں جب اس کے مکان کے سامنے سے گزرتا میری نظر
شمی پر ہی رہا کرتی۔ اگر کبھی اس راستہ سے واپس نہ آتا تو نگاہوں میں
ایک بھوک سی باقی رہتی۔

کبھی کبھی للّو کا بھائی، مجھے اور للّو کو شمی کے ہاں لے جاتا۔ اُن دنوں
شمی گانا سیکھ رہی تھی۔ ان کے گھر بھر میں میری اور للّو کی بدصورتی کا
مذاق اُڑتا جس میں ان کے طنز اور کراہت کا پہلو نہ ہوتا بلکہ محبت ٹپکتی
شمی کو موقع ملتا تو گھر والوں سے جھگڑتی اور کہتی۔ آخر یہ بھی تو خدا کے
بنائے ہیں۔ یہ ہمدردی غیر محسوس طور پر مجھے اس کے قریب کرتی رہی۔

ایک دن یکایک دیکھا کہ شمی کی والدہ بال بچوں سمیت جا رہی ہے
میں جب حسرت سے سامان کو لدتے دیکھ رہا تھا تو شمی نے صرف اتنا کہا

—— "ہم بمبئی جا رہے ہیں۔"

شمی کے جانے کے بعد میری عادی نگاہیں اس کے بند دروازوں
سے ٹکرا کر واپس لوٹتی رہیں۔"

اس کے بعد بھی بڑا طول طویل قصہ ہے۔ کئی برس بعد ہیروئن بمبئی سے لوٹتی ہے
ہیرو بھی باوجود کئی برس گزرنے کے نہیں بھولتے۔ قیامت یہ ہوتی ہے کہ جب ہیروئن بمبئی
سے لوٹتی ہے تو اُس کی جوانی ترازو میں تُل رہی ہوتی ہے۔ یہ بھی لڑکپن سے نکل کر اور
اُردو ادب کی تمام عاشقانہ شاعری ہضم کر کے تیار سے ہوتے ہیں۔
چوری چھپے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ یہ بے نیازی برتتے ہیں اور وہ اپنی جگہ گھائل،

بالآخر اس داستان کا انجام یوں ہوتا ہے کہ وہ انھیں نکاح کے دو بولوں کے لیے کہتی ہے اور یہ روایتی ہیروؤں کی طرح گاؤں سے لاہور آ جاتے ہیں۔

اگر آپ کو مندرجہ بالا واقعہ پر یقین نہ آئے تو نہ سہی۔ لیکن یہ ہے واقعہ، جو انھوں نے اپنی خود نوشت سوانح میں انھی الفاظ کے ساتھ لکھ رکھا ہے۔ اور اس سوانح کے تیس چالیس صفحات تو لکھے جا چکے ہیں۔ بقایا سوانح اس لیے نہیں لکھتے کہ لوگ بعد میں لکھتے رہیں گے۔

ان کی جتنی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ اُن سے زیادہ نامکمل پڑی ہیں۔ اور جتنی نامکمل ہیں۔ ان سے زیادہ ذہن میں ہیں۔

ان کی گفتگو اور تحریر میں میرے نزدیک کوئی فرق نہیں۔ بلکہ بعض اوقات مجھے یہ شبہ ہوا ہے کہ ان کی گفتگو ان کی تحریروں سے زیادہ جاندار ہے۔ ممکن ہے یہ بات صحیح نہ ہو۔ اس لیے کہ میں نے ان کی باتیں غور سے سُنی ہیں، ان کی کتابیں غور سے نہیں پڑھیں۔

یہ قطعی سیلف میڈ قسم کے آدمی اور شاعر ہیں۔ جو کچھ کیا خود کیا۔ یہ اپنے ہر اچھے اور ہر بُرے کام کے خود مقتدی ہیں اور خود ہی امام۔

جس شخص نے مزدوری کرتے کرتے اتنی ترقی کر لی ہو کہ ہندوستان اور پاکستان کا پڑھا لکھا طبقہ نہ صرف انھیں جانتا ہو بلکہ ان کے شعر گنگناتا بھی ہو تو یہ حادثہ اپنی جگہ کوئی معمولی بات ہو ہی نہیں سکتی۔

مزدوروں کے تو یہ بے تاج بادشاہ ہیں۔ اس لیے کہ مزدور ان کا کلام سمجھنے

کی اہلیت نہیں رکھتے۔

ان کی اُونچے اُونچے لوگوں سے واقفیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ اپنا اور اپنے خاص قسم کے دوستوں کا ہر جائز اور ناجائز کام کرا لیتے ہیں اور اگر کوئی نہ کرے تو یہ اُسے دھمکی دے آتے ہیں کہ تمہارے خلاف نظم لکھوں گا۔ یہ بھی اپنے وقت کے اچھے خاصے سودا ہیں۔

احسان صاحب ذہنی طور پر بڑے باغی واقع ہوئے ہیں۔ ان کی سرشت میں بغاوت رچی ہوئی ہے۔ ان کی زندگی بھی اِس ڈھب سے گزری ہے کہ ان پر یہ ردِ عمل کچھ لازمی ہی تھا۔ وہ گورنر جنرل ہاؤس میں بیٹھ کر گورنر جنرل اور پوری کابینہ کے سامنے اس قسم کی باغیانہ نظم پڑھنے کی جرأت رکھتے ہیں۔

دولت کے محافظ سانپوں کو بانبی میں نہ چھوڑا جائے گا
قبروں میں دریچے کھولیں گے، مُردوں کو جھنجھوڑا جائے گا
بے شرعِ عدالت گاہوں کے قانون کو توڑا جائے گا
حاکم جو رعایا دشمن ہیں، دجّال ہیں وہ، حکّام نہیں
اے دوست ابھی آرام نہ کر، آرام کا یہ ہنگام نہیں

جب اِس جرأتِ رندانہ کا علم مجھے ہُوا تو میں نے ان کی خدمت میں عرض کیا۔

"اتنی تیز چیزیں نہ لکھا کریں۔ پکڑ لیے جائیں گے۔"

"میاں! میں قید و بند سے نہیں ڈرتا۔ حکومت مجھے کل گرفتار کرتی آج کر لے۔ میں باہر کونسی آرام کی زندگی گزار رہا ہوں۔ خیال یہ ہے کہ حکومت مجھے بی کلاس میں رکھے گی۔ اگر بی کلاس میں رہوں تو بیشک میرے ساتھ میرے بیوی بچّوں کو بھی عمر بھر کی

قید کر دے۔

اگر اس نظم کی وجہ سے مجھے سات برس کی بھی قید ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں انشاء اللہ سات بچے اور ساتھ لاؤں گا۔ اُس وقت میرا جیل سے باہر گزارا اور مشکل ہو جائے گا۔ اس لیے باہر آتے ہی مجھے ضرورتاً اُس سے بھی تیز نظم لکھنی پڑے گی نتیجتہً پھر جیل کے اندر۔ اگر اسی آنے جانے میں بقایا دن کٹ جائیں تو سمجھوں گا شعر و شاعری کام آگئی۔

یوں تو انھیں تمام اساتذہ سے فیض حاصل کرنے کا شوق نہیں خبط ہے لیکن غالب ان کا محبوب شاعر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیچارا ان کا زیادہ تختۂ مشق بنا۔ انھوں نے ان کے کلام کی شرح لکھ ڈالی۔ پہلی لکھی ہوئی شرح جب اپنی نظر میں نہ جچی تو دوبارہ لکھ ڈالی۔

میرے نزدیک ان کی شرح میں خوبی یہ ہے کہ جتنے شارحین نے اب تک شرحیں لکھی ہیں۔ ان کی شرح ان سے قطعی مختلف ہے۔ فرق بھی زمین آسمان کا، جو معنی اُنھوں نے کسی شعر کے لیے، انھوں نے اُن کے بالکل برعکس لیے۔ کسی شارح نے رات کے معنی رات لے لیے تو انھوں نے اس کی تردید کی ہے کہ نہیں غالب نے رات کو بہ معنی دن باندھا ہے۔ اسی طرح سب کو جھٹلاتے اور بیوقوف بناتے ہوئے اپنی غالب فہمی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں۔ اگر کوئی دوسرا غالب کا کلام سمجھنے والا انھیں ہاتھ لگ جائے تو اکھاڑہ بندھ جائے گا۔ دلیلوں پہ دلیلیں، سگریٹ پہ سگریٹ، چائے پہ چائے، لیکن کوئی کیسے مان لے کہ یہ دن نہیں رات ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ انھوں نے اچھے خاصے پڑھے لکھے آدمی کو اپنی غالب فہمی ہی سے چکرا دیا۔

ان کی خوبی یہ ہے کہ سیاہ کو سفید کہو اور پھر ضد کہ اس پر بحث کر لو۔ لوگ دو وقت کھانا کھاتے ہیں۔ یہ ایک وقت کھاتے ہیں۔ اس لیے کہ لوگ دو وقت کھاتے ہیں۔ یہ چارپائی پر اس لیے نہیں سوتے کہ سب چارپائی پر سوتے ہیں۔

یہ قابلیت سے زیادہ ذہانت کے مالک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بڑے جرأت مندانہ طریقے پر اس قسم کی خوفناک باتیں سوچ کر بھی اپنے مسائل سلجھا لیا کرتے ہیں:۔

"یار میں نے انار کلی میں فلاں بینک کی بلڈنگ پر قبضہ کر لیا ہے۔ بیوی بچوں سمیت گھر کا سامان لا کے ڈال دیا ہے۔ جب میں اپنا سامان لا رہا تھا تو ساری انار کلی والے مجھے گھور گھور کے دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا کباڑ لیے آ رہا ہوں۔ کہیں بوریاں تھیں تو کہیں پھٹے ہوئے لحاف اور کہیں تین پاؤں والی چارپائی، کہیں کبوتروں کی کابکیں تھیں اور کہیں یہ اور کہیں وہ ــــ"

میں نے پوچھا "یہ بینک کب الاٹ کرایا تھا؟"

بھئی الاٹ والاٹ کچھ نہیں کرایا۔ مجھے معلوم ہوا کہ بینک خالی ہے۔ میں نے تالا توڑا اور اپنے گھر والوں کو لا کر بھر دیا۔ ب دیکھا جائے گا کہ کیا ہوتا ہے۔"

الاٹمنٹ والے صاحب آئیں گے تو ان سے بھی نپٹ لوں گا۔ پہلے تو نہایت مؤدب بن کر عرض کروں گا کہ میرے پاس کوئی اچھا مکان نہ تھا۔ اس لیے مجبوراً اس میں آیا ہوں۔ لہذا یہ جگہ اب میرے ہی نام الاٹ کر دیں۔

اگر وہ صاحب نہ مانے اور پولیس کو لے آئے کہ مجھے بے دخل ہی کر کے رہیں گے تو میں نیچے سے کھٹکا لگا کر اوپر کی منزل پر چڑھ جاؤں گا اور اپنے ایک برس کے بچے کو لے جا کر اوپر کی چھت سے نیچے گرا دوں گا۔

ظاہر ہے کہ بچہ مر جائے گا۔ ہزاروں لوگ اکٹھے ہو جائیں گے۔ اس صورت میں پولیس اور ریہبلٹیشن والوں کو اپنی جان بچانی مشکل ہو جائے گی —— میرا کیا ہے دوسرے سال ایک بچہ اور ——"

آپ کو کبوتر پالنے کا بھی شوق ہے۔ انھیں کی کابکیں تھیں۔ جن کو لا کر انھوں نے انار کلی میں سب کو حیرت زدہ بنا دیا تھا۔ ایک شاعری کا شوق ہی کونسا کم تھا کہ کبوتر بھی پالتے ہیں جناب، وہ بھی ایسے ویسے نہیں، قسمِ خاص، قاصد نسل کے، جو پیغام لاتے اور لے جاتے ہیں۔ نہ جانے ان کے کتنے پیغام آئے اور گئے۔ بہرحال یہ پلتے صرف قاصد کبوتر ہی ہیں۔ ایک کبوتر کو دیکھ کر اس کی چار نسلوں تک کا پتہ بتا دیتے ہیں کہ اس کبوتر کی ماں ایسی تھی اور باپ ایسا، اور اس کبوتر کے دادا کا ہاضمہ درست تھا یا نہیں اور اس کبوتر کی پڑدادی کا اخلاق اچھا تھا یا برا۔

کبوتروں کے معالجات میں بھی انھیں بڑی دسترس ہے۔ جس طرح ہمارے ہاں انسانی بیماریوں کے لیے کرنل الٰہی بخش مشہور ہیں۔ اسی طرح یہ کبوتروں کے کرنل الٰہی بخش ہیں۔ اگر کسی کبوتر، کبوتری کو کوئی "زنانہ، مردانہ" بیماری ہو جائے تو یہ اس کا علاج اتنی تندہی اور اتنے انہماک سے کریں گے کہ کیا کسی ڈاکٹر نے کسی عظیم شخصیت کو بچانے کے لیے کیا ہوگا۔

خود بتاتے ہیں کہ ایک بار آغا حشر نے ان پر دو لاکھ روپے کا ہتک عزت کا دعویٰ کر دیا تھا۔ کلکتہ سے وارنٹ آئے۔ جب انھیں معلوم ہوا تو خود ہی تھانے پہنچ گئے اور تھانیدار سے کہا۔ مجھے گرفتار کر لیجئے۔ گرفتاری کے لیے یہ فراخدلانہ پیشکش اس لیے کی تھی کہ انھیں علم تھا کہ اس قسم کی گرفتاریوں پر سارا خرچہ مقدمہ کرنے والے کا ہوتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے کھانے پینے کے سلسلے میں اپنے سارے ارمان نکال لیے۔

کلکتے پہنچے تو ضمانت ہو گئی۔ چونکہ مقدمہ لڑنا تھا اس لیے وہاں کے کسی اخبار میں ملازم ہو گئے۔ ملازمت کا سلسلہ بھی چلتا اور مقدمہ بھی چلتا رہا۔

دو تین مہینے کے بعد انھوں نے لاہور پہنچ کر جوابی مقدمہ کر دیا۔ آغا صاحب نے ہتک عزت کا مقدمہ کیا تھا انھوں نے شہرت کو نقصان پہنچانے کا۔ آغا صاحب لاہور آئے اور دوسری ہی پیشی پر لاہور کے چند ادیبوں کو بیچ میں ڈال کر صلح کر لی۔

یہ کہتے ہیں کہ صلح ہو جانے کا مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ اس لیے کہ عدالت میں جاتے اور آتے ہوئے جو آزادانہ نوکدار گالیوں کا تبادلہ ہوتا تھا وہ ختم ہو گیا تھا۔

یہ ذہناً مذہبی قسم کے بزرگ ہیں۔ روزے تیس کے تیس رکھتے ہیں نمازیں پانچ کی پانچ نہیں پڑھتے۔ مذہب کے معاملے میں جو ان کے عقائد ہیں وہ بھی سب نرالے جو سنے جا سکتے ہیں لکھے نہیں جا سکتے۔ طبیعت رواں ہوگی تو بڑی بڑی خطرناک باتیں چھے تُلے فقروں میں کہتے چلے جائیں گے۔ میرا دل بہت چاہتا ہے کہ ایک آدھ

مثال پیش کر دوں۔ بس اتنا ڈر ہے کہ مسلمان مجھے قتل کر دیں گے۔

یہ بے حد جری اور جفاکش ہیں۔ بڑے سے بڑے امتحان کو اپنے اوپر وارد کر لیں گے۔ چھوٹے سے چھوٹے کام کے کرنے میں بھی انھیں کوئی عار نہیں۔ اکثر بھاری بھاری سامان اپنے کندھے پر اٹھاتے ہوئے دیکھے گئے ہیں۔ دکان میں ضرورت پڑنے پر جھاڑو بھی خود دے لیں گے۔ اگر بھنگی ہڑتال کر دیں گے تو ان کی ڈیوٹی بھی بہ خوشی انجام دے لیں گے۔ غرض جتنی ذاتی مدد آپ کرنے پر یہ قادر ہیں۔ کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک دن کہنے لگے کہ ہم جیتے تو مردوں کی طرح، لیکن مرنا ٹھاٹھ سے چاہتے ہیں۔ پارٹیشن سے پہلے تو ایک بڑی عمدہ سکیم ذہن میں تھی لیکن اب وہ بیکار ہو گئی ہے۔ خیال تھا کہ مرنے سے پہلے وصیت کرتا۔ مسلمانوں سے کہتا کہ میرے انتقال کے بعد میرے شعروں کی تمام کتابوں کو جلا کر راکھ کر دیا جائے اس لیے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے شعر گوئی کوئی اچھی چیز نہیں۔ دوسرے یہ کہ دفنانے سے پہلے میرے گھر کی ایک ایک چیز کو نیلام کر کے اللہ کی راہ میں دے دیا جائے اور ساتھ ہی یہ کہ میں فلاں برگزیدہ ہستی کا مرید ہوں۔ اس لیے میری قبر ان کے قدموں میں بنائی جائے۔

ادھر سناتن دھرم والوں کو لکھ دیتا کہ میں تو اصل میں ہندو تھا۔ خواہ مخواہ مسلمانوں نے مجھے جکڑ رکھا تھا۔ اب چونکہ مر رہا ہوں۔ اس لیے مسلمانوں سے کسی قسم کا خطرہ نہیں رہا۔ لہٰذا میری لاش کو مسلمانوں سے بچایا جائے اور ہندو قوم کا ایک فرد ہونے کی حیثیت سے میری لاش کو جلایا جائے اور میری راکھ کو گنگا میں بہا دیا جائے۔

اِدھر سے مسلمان میرے شعروں کی کتابیں جلا کر اور میرے گھر کی ایک ایک چیز نیلام کر کے دفنانے کے لیے چلتے اُدھر سے سناتن دھرم والے پہنچ جاتے میری لاش کو حاصل کرنے، دونوں میں زوروں کا فساد ہوتا۔ پھر لاٹھی چارج ہوتا۔ گولی چلتی، دو چار میری لاش پر گرتے۔ سینکڑوں ڈھیر ہوتے۔ ہزاروں جیل جاتے، تب مزا آتا۔ اب تو کمبخت تقسیم نے مرنے کا مزا بھی کرکرا کر دیا ہے۔"

یہ شیخوپورہ اکثر جایا کرتے ہیں۔ بہت دنوں بعد مجھ پر یہ راز کھلا کہ یہ شیخوپورہ کیوں جاتے ہیں۔ قصہ یہ ہے کہ جب ان کے احباب (بیگار کے طور پر) انھیں کسی مشاعرے کی دعوت دیتے ہیں تو عموماً ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ اُس دن تو مجھے شیخوپورہ میں ایک بڑا ہی ضروری کام ہے۔ بہرحال حاضری کی کوشش کروں گا۔

اگر مخاطب یہ پوچھ بیٹھے کہ وہاں کیا کام ہے تو فوراً جواب دیں گے۔ "ایک لائبریری سے مجھے تین چار سو روپوں کی کتابوں کا آرڈر مل جائے گا۔ اس لیے مجبوراً جا رہا ہوں۔ اگر اتنی رقم آپ دے سکتے ہیں تو آپ کی خاطر جانا ملتوی کر سکتا ہوں۔"

اس بات پر میں نے انھیں یہ کہا کہ آپ اپنے ملنے والوں سے یہ بہانا تو کر دیتے ہیں کہ ٹھیک اُسی تاریخ کو شیخوپورہ جاؤں گا۔ ظاہر ہے کہ آپ نہیں جاتے۔ اگر وہی صاحب آپ کو اُسی دن مل جائیں جن سے آپ نے شیخوپورہ جانے کو کہہ رکھا ہے تو کیا ہو۔

کہنے لگے۔ "ہوتا کیا ہے کہہ دوں گا جا کر آ گیا ہوں۔ یا جانے والا ہوں۔"

یہ طبعاً کاروباری آدمی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اچھے خاصے تعلقات کی بھی پروا نہیں کرتے۔ بلکہ کبھی بھی پروا نہیں کرتے۔ ویسے یہ زبان حال سے بھی

کہیں گے کہ سخت بیوقوف قسم کا آدمی ہوں۔ اللہ نے مجھے ذرا سا بھی کاروباری آدمی نہیں بنایا۔ لیکن آپ ان کی بات پر مطلق کان نہ دھریں۔ اس لیے کہ اس بات میں کوئی صداقت نہیں۔

اکثر یہ کہتے ہیں کہ تقسیم سے پہلے میرے پاس بائیس ہزار روپیہ تھا اب کچھ نہیں۔ ممکن ہے اس میں کچھ صداقت ہو۔ صداقت اس اعتبار سے تو یقینی معلوم ہوتی ہے کہ قیامِ پاکستان سے پہلے ان کے پاس اتنا روپیہ ہوگا۔ لیکن اب اس کے متعلق کچھ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا۔

باور کیجیے اگر کسی وقت ان کا کوئی اٹرنگا لگ گیا تو ان کے سارے ارمان ایک دم پورے ہو جائیں گے۔ اس لیے کہ ان کا دماغ بڑا زرخیز ہے اور انہیں ہر وقت بڑی عجیب و غریب باتیں سوجھتی رہتی ہیں۔ ویسے یہ آج کل اچھے حالات کی تاک میں ضرور ہیں۔

ابھی ان کا داؤ لگا نہ تھا کہ جس سے کچھ روپیہ وغیرہ ہاتھ آتا کہ ایک دن انکم ٹیکس آفیسر صاحب ان کے پاس پہنچ گئے۔

"حساب دکھائیے!"

"حساب کیسا؟"

"جو بکری وکری ہوتی ہے اُس کا۔"

"قبلہ انکم ٹیکس آفیسر صاحب، یہاں بکری نہیں ہوتی جو حساب رکھوں۔"

"اگر بکری نہیں ہوتی تو زندہ کیسے ہیں اور یہ جو چائے اُڑ رہی ہے بغیر آمدنی کے

کیسے آسکتی ہے۔"

"حضور یہاں چائے تو تین چار روپے روز کی ضرور اُڑتی ہے۔"

"تو پھر آمدنی بھی ہزار ڈیڑھ ہزار روپیہ ماہانہ کی ضرور ہو گی۔"

"میری سنیں تو آپ کی غلط فہمی جلد رفع ہو جائے۔ میرے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ جو یہاں آئے وہ پہلے ہوٹل میں چائے کا آرڈر دے کر آئے۔ تمام لوگ میرا ہی دماغ چاٹنے آتے ہیں۔ چائے کو تو میں نے اپنی دماغ چٹائی کے معاوضے یا جرمانے طور پر جاری کر رکھا ہے۔ اگر آپ یہاں مسلسل آتے رہے تو آپ کو بھی یہی کچھ کرنا پڑے گا۔

"دیکھا جائے گا۔ کل حساب لے کر دفتر تو آئیے۔"

"آپ ناحق میرا اور اپنا وقت ضائع کریں گے

ان کے ہاں روز منڈلی لگی رہتی ہے۔ جسے ذہنی بدہضمی ہو جاتی ہے۔ وہ شعر کہنے شروع کر دیتا ہے اور اصلاح لینے پہنچتا ہے ان کے پاس، یہ ان حضرات کے شعروں کی نوک پلک درست کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی اپنی شان میں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے جاتے ہیں۔ دو چار نادر قسم کے فقرے کہہ کر مرعوب کر لیا۔ کچھ اپنے خلوص کا یقین دلا دیا۔ کچھ اپنی سادگی اور علم کے بارے میں فرما دیا۔ کچھ اپنی جرأت اور بیباکی کے تذکرے کر کے اپنا رعب قائم کر دیا۔ کچھ اپنی زندگی کے حالات سنا کر متحیر کر دیا۔ غرض ؎

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے
عمر یونہی تمام ہوتی ہے

یوں تو یہ ہندوستان بھر کے مشاعروں میں پھرے۔ لیکن ایک بار لکھنؤ والوں

نے ان سے انتقام لیا۔ اس لیے کہ یہ وہاں جاکر بھی مشاعرہ لوٹ لیا کرتے تھے۔ شعر بھی اچھے ہوتے تھے اور ترنم تو ان کا وہاں کے آگرہ والوں کو بھی پسند تھا۔

بعض حضرات کو اپنے گھر میں کسی دوسرے کی توقیر گوارا نہ تھی۔ اس لیے انھوں نے ایک طرحی مشاعرہ منعقد کرایا اور مصرع طرح یہ رکھا۔ ع

سینے کے داغ دل کو درخشاں نہ کرسکے

اور انھیں کوئی اطلاع نہ دی کہ مشاعرہ طرحی ہوگا۔ جب یہ اسٹیشن سے اُتر کر مشاعرہ میں پہنچے تو ان کے پاؤں تلے سے ڈائس کھسک گیا۔

اس واقعہ کو یہ بڑی شان اور آنکھوں میں ایک خاص قسم کی چمک پیدا کرکے سنایا کرتے ہیں۔ لیکن ہوا یہ کہ انھوں نے وہیں بیٹھے بیٹھے طرح پر غزل کہی اور جب ان کا نام پکارا گیا تو انھوں نے طرح میں غزل پڑھ دی۔ حسب سابق داد ملی اور کسی کو علم تک نہ ہوسکا کہ یہ غزل ابھی چند منٹ پہلے پیدا ہوئی تھی۔

تاجور مرحوم سے انھیں بڑی عقیدت رہی ہے۔ اُن سے انھوں نے بہت کچھ سیکھا بھی ہے۔ آج اُردو شاعری میں احسان صاحب کا جو مرتبہ ہے اس میں تاجور مرحوم کا بڑا ہاتھ ہے۔ لیکن یہ اُن کی خدمت میں نیازمندی کے ساتھ ساتھ گستاخی کی حدوں تک بے تکلف بھی تھے۔

تاجور مرحوم اپنی زندگی میں ایک صدمہ کی تاب نہ لاکر خاموش رہا کرتے تھے کوئی بات ہوتی تو صرف ہوں ہاں سے آگے نہ بڑھتے۔ خود لطیفہ ساز تھے۔ مگر اُن دنوں لطیفے بھی ہوتے تو بہ تکلف مسکرانے کی تہمت گوارا کرتے۔ ہر وقت گھر میں پڑے رہتے۔

انھیں معلوم ہوا تو انھوں نے انھیں صحتیاب کرنے کی ایک عجیب و غریب صورت نکالی۔

ایک ہوٹل میں پہنچے۔ بیرے سے کہا ابھی ایک داڑھی والے صاحب کو لاؤں گا۔ ان کے لیے ایک عورت کا انتظام کر دو۔

کچھ باتیں کان میں بھی کہہ دیں۔

چنانچہ عورت کا انتظام ہوا۔ اور یہ تاجور صاحب کو کسی بہانہ سے ہوٹل میں لے آئے اور انھیں بٹھا کر خود کھسک گئے۔

اب وہ محترمہ تخلاق ہوئیں تاجور صاحب کے سامنے آ کر بیٹھ گئیں۔ یہ اُسے دیکھتے ہی ایک دم اچھل پڑے۔ وہ ناز و ادا سے رجھانا چاہتی تھیں۔ یہ اپنی پریشان طبیعت کو اور پریشان ہوتے دیکھ کر بھاگنے کی سوچنے لگے۔

جب عورت کو اپنی مہم میں ناکامی نظر آنے لگی تو وہ اُن سے پروگرام کے مطابق چمٹ گئی۔ اس وقت انھوں نے احسان صاحب کو وہ وہ بے نقط گالیاں دیں کہ تاجور دے اور احسان لے۔

خوش قسمتی ان کی یہ کہ احسان صاحب نے دروازے کی آڑ سے وہ سب وصول کرلیں۔ آج بھی انھیں معلوم ہے کہ مرحوم نے انھیں کون کون سی گالی دی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ وہ کئی دن تک احسان صاحب کو گالیاں دیتے رہے۔ یوں ان کا چپ رہنا، ان کی اسکیم کے مطابق ختم ہوا۔

ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے "ملکِ ادب کے شہزادے" میں ان کا حلیہ یوں بتایا ہے :-

گزشتہ پریشانیوں کا کوئی پتہ اب اُن کی وضع قطع سے نہیں مل رہا تھا۔ نہایت اچھی سرج کی دھاری دار شیروانی، اچھے مینکلاٹ کا ڈھیلا پاجامہ پہنے تھے۔ سر پر انگریزی بال نہ تھے۔ بال کم تھے اور اتنے چھوٹے کہ اگر وہ کوشش کرتے بھی تو مانگ نہ نکل سکتی تھی۔ پیشانی کشادہ تھی، آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ ناک اوسط درجہ کی، دہانہ کسی قدر گول تھا۔ چہرہ کا رنگ کسی قدر سیاہی مائل تھا۔ قدرت نے بڑی صناعی یا ستم ظریفی سے رنگ آمیزی کی تھی۔ رخسار پر مصورِ قدرت نے یکساں قلم نہیں پھیرا تھا۔ کہیں پر رنگ ہلکا نظر آتا تھا کہیں گہرا، ان کے چہرہ کو دیکھ کر مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ جیسے دھوپ چھاؤں کا منظر سامنے آ گیا ہو۔ یہ ملاقات اگر ۱۹۴۷ء کے بعد ہوئی ہوتی تو مجھے ضرور خیال ہوتا کہ ان کے چہرہ پر ایک طرف ہندوستان ہے اور دوسری طرف پاکستان۔"

انھیں اپنی والدہ سے بے پناہ محبت تھی۔ اکثر ان کی باتیں گلوگیرانہ انداز میں سنایا کرتے ہیں۔ بھلا محبت کیوں نہ ہو۔ انھوں نے اپنی والدہ کے بارے میں ایک واقعہ اپنے سوانحی حالات میں یوں لکھا ہے :-

ایک بار ہم دُور ایک گاؤں میں ایک شادی میں شرکت کیلئے جا رہے تھے۔ اور میں ایک دقیانوسی نمونے کی بیل گاڑی میں سے نکل کر سامان والی گاڑی کے اُوپر

جا بیٹھا۔ یہ گاڑی ایک جنگل سے گزر رہی تھی اور کبھی کبھی درختوں کی ٹہنیاں میرے سر اور منہ سے ٹکراتی تھیں تو لطف آتا تھا۔ میں اسی طرح خوش خوش جا رہا تھا کہ اچانک ایک کیکر کی شاخ اسباب کے ذرا اُوپر تیرتی ہوئی آئی اور میری دائیں آنکھ میں خراش دیتی ہوئی نکل گئی۔ میں نے چیخ ماری اور دونوں ہاتھ آنکھ پر رکھ کر منہ کے بل اسباب پر گر پڑا۔

میرے والد جلدی سے آئے اور میری آنکھ سے خون بہتا ہوا دیکھ کر گھبرا کر بولے۔ او ہو' آنکھ گئی۔ اس آواز کے ساتھ والدہ کی چیخ اور بہن کے رونے کی دردناک آواز جنگل کے اندھیرے میں بھٹکنے لگی۔

ایسی حالت میں والد صاحب نے گھر واپسی کے لیے گاڑی موڑ لی۔ گھر پہنچے تو یہ خبر تمام محلے میں پھیل گئی۔ عیادت کرنے والی عورتوں میں ایک منو ہری آئی اور اس نے رازدارانہ لہجے میں یہ علاج بتایا کہ اس کی آنکھ میں خون ڈالو۔ اس کے بعد کچھ چپکے چپکے گفتگو ہوئی۔ جسے میں نہ سن سکا۔

اس رات جیسے تیسے ہوا سو گیا۔ ابھی صبح ہونے ہی والی تھی کہ کسی نے میری آنکھ کھول کر زبردستی کوئی دوائی ڈال دی۔ دیکھا تو والدہ نے اپنی اُنگل کے دو پور ڈورے سے جکڑ کر لہو اکٹھا کر کے شگاف دیا ہوا تھا۔ یہ دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ میرے منع کرنے کے باوجود یہ عمل ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ اور ایک ہفتہ کے بعد میری والدہ کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں کئی جگہ سے ترشی ہوئی تھیں۔"

میں نے اس مضمون میں قصیدہ خوانی کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس لیے کہ یہ درویش صفت انسان صرف اپنی تعریف سے کبھی خوش نہیں ہوئے۔

چلتے چلتے اگر میں ان کی کچھ "کمزوریاں" بھی عرض کر دوں تو میں سمجھوں گا۔ اپنے فرض سے سبکدوش ہوا۔

طبیعت میں خلوص ہی خلوص!

رہن سہن میں قلندرانہ شان!

ناداروں کے لیے عملی ہمدردی!

ظالموں کے لیے نفرت ہی نفرت!

اگر ان میں سے کوئی ایک "خرابی" بھی کسی میں ہو تو میں اس کی دوستی پر فخر کروں گا۔